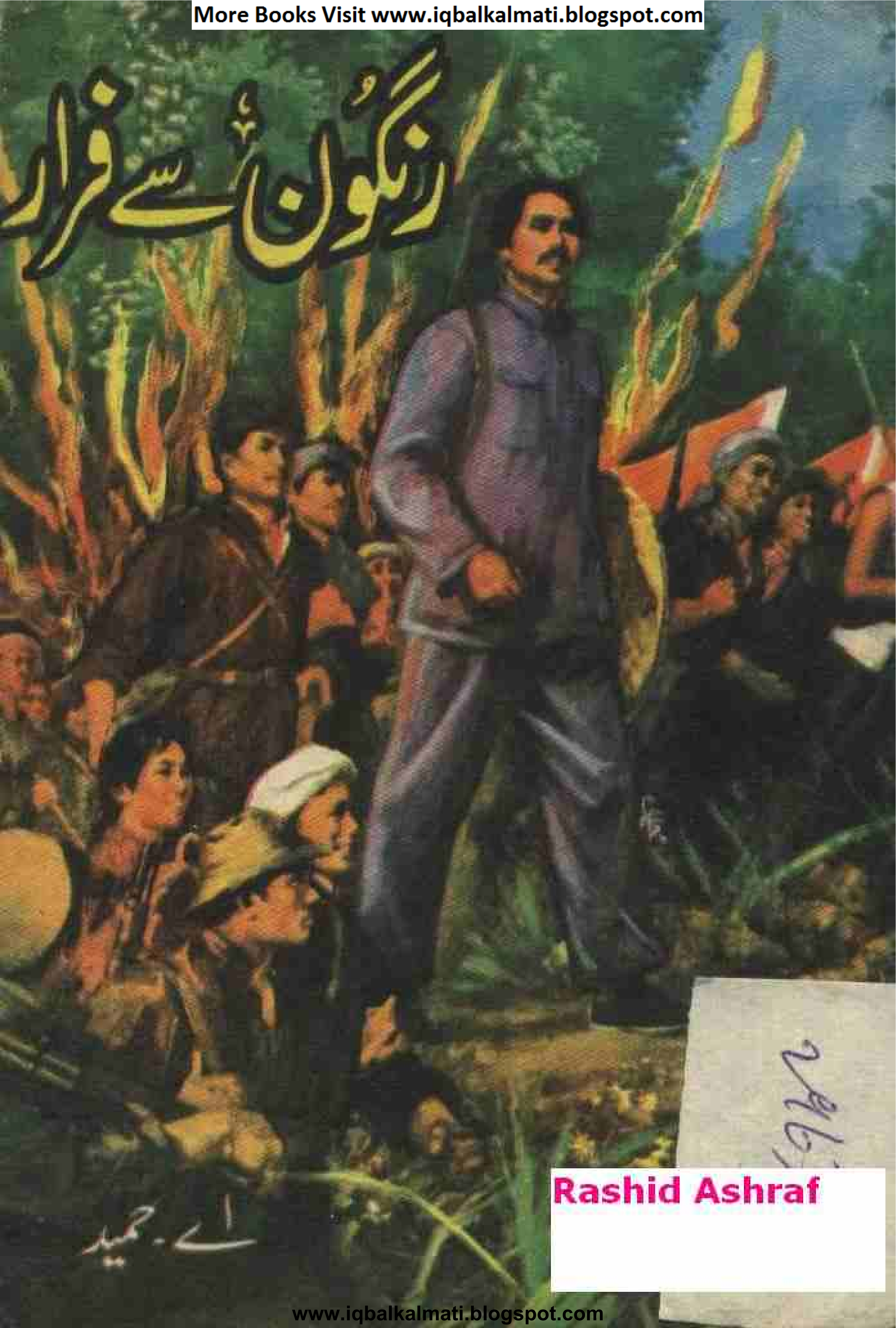

رنگون سے فرار
اے۔ حمید
Rashid Ashraf

دوسری جنگِ عظیم کا ایک سچا واقعہ

رنگون سے فرار

اے حمید



شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز

لاہور —— حیدرآباد —— کراچی

طابع — شیخ نیاز احمد
مطبع — غلام علی پبلشرز، لاہور
قیمت — تین روپے

مقام اشاعت
شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز
ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور

فہرست

اپنی پیاری بیٹی

لالہ رُخ کے نام

Rashid Ashraf-zest70pk@gmail.com

باب ۱

جاپانیوں کا حملہ

پیارے بچو!

ہماری دلچسپ اور حیرت انگیز کہانی کا تعلق دوسری جنگِ عظیم سے ہے۔

یہ تو آپ میں سے سبھی جانتے ہیں کہ دوسری جنگِ عظیم ۱۹۳۹ء میں شروع ہو کر ۱۹۴۵ء میں ختم ہوئی۔ اس جنگ میں امریکہ، برطانیہ فرانس اور روس ایک طرف تھے جنہیں اتحادی طاقتیں کہتے تھے اور جرمنی، جاپان اور اٹلی ایک جانب تھے جنہیں محوری طاقتیں کہا جاتا تھا۔ یہ جنگِ عظیم یورپ، مشرقِ وسطیٰ اور مشرقِ بعید یعنی برما، ملایا اور ہند چینی کے محاذوں پر لڑی گئی۔ جو کہانی ہم آپ کو سُنانے لگے ہیں اس کا تعلق برما کے محاذ سے ہے۔ شروع شروع میں جاپان جنگ میں شامل نہیں ہوا تھا اور یہ محاذ بالکل خاموش تھا۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد جاپان بھی میدانِ جنگ میں کود پڑا اور اس محاذ پر بھی گھمسان کا رَن پڑنے لگا۔ جاپانی ایک طوفان کی طرح آگے بڑھنے لگے۔ انہوں نے دیکھتے دیکھتے کئی چھوٹے چھوٹے ملکوں پر قبضہ کر لیا اور وہ انڈونیشیا اور سیام سے ہوتے ہوئے

برما کی سرحد پر پہنچ گئے۔ برما پر اُن دنوں انگریزوں کی حکومت
تھی۔ لیکن یہاں انگریزوں کی جنگی تیاریاں ناکافی تھیں۔ جس کی سب
سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انگریز یورپ کے محاذ پر بھی جنگ لڑ رہا
تھا اور جرمنی کے بمبار طیاروں نے لندن کی اینٹ سے اینٹ
بجا دی تھی۔ جرمنی طیارے دن میں کئی کئی مرتبہ لندن اور انگلستان
کے دوسرے شہروں پر آکر تباہ کن بمباری کرتے۔

جاپانی بڑی آسانی سے برما کے جنگلوں میں گھس آئے۔ اُن
کا ڈٹ کر اگر کسی فوج نے مقابلہ کیا تو وہ ہماری پنجاب، بلوچ
اور فرنٹیئر فورس کی رجمنٹیں تھیں۔ لیکن انگریزی ہائی کمانڈ چونکہ
یورپ کے محاذ پر اپنی مصیبت میں پھنسا ہوا تھا اس لیے وہ
ان بہادر اور لڑاکا فوجوں کی سپلائی لائن بحال نہ رکھ سکا۔ اور یہ تو
آپ کو بھی معلوم ہے کہ اگر فوج کو گولہ بارود نہ ملے تو وہ کہاں تک
دشمن کا مقابلہ کر سکتی ہے! چنانچہ وہی ہوا کہ جاپانی ہر آن تازہ دم رسد
ملتی رہنے کی وجہ سے برما کی سرحدوں میں آگئے اور برما کے گنجان
جنگلوں میں بڑے زور کی لڑائی شروع ہو گئی۔ انگریزی فوجوں نے
پسپا ہونا شروع کر دیا۔ رنگون برما کا دارالحکومت تھا۔ یہاں کی انگریزی
حکومت نے جب دیکھا کہ جاپانی تو آگے ہی بڑھتے چلے آرہے
ہیں تو وہ اپنا بوریا بستر باندھ کر شملے آگئی۔

سرکار بھاگی تو فوج اور عوام کے پاؤں بھی اکھڑ گئے۔ جاپانیوں

نے رنگون پر قیامت خیز بمباری شروع کر دی۔ رنگون کی بندرگاہ پر
کھڑے تیل کے جہازوں میں آگ بھڑک اٹھی۔ سارے شہر پر دھواں
پھیل گیا۔ بم شہر کے گلی محلوں میں بھی آکر گرے جس کی وجہ سے
عمارتیں گر پڑیں اور سڑک کے چوراہوں میں گڑھے پڑ گئے۔ ہر
طرف ایک افراتفری پھیل گئی۔ ہر کوئی جان بچانے کی فکر میں اِدھر
اُدھر بھاگنے لگا۔ ہر ایک کی زبان پر یہی لفظ تھا کہ 'جاپانی آگئے'،
'جاپانی آگئے'! بمباری وقفے وقفے سے ہوتی تو شاید رنگون کے
لوگوں میں اتنی بھگدڑ نہ مچتی۔ مگر جاپانی بمبار طیارے تو بیس بیس کی
ٹولیاں بنا کر دن میں کئی بار آتے اور رنگون کی اینٹ سے اینٹ
بجا کر واپس چلے جاتے۔ اس کے علاوہ لوگوں میں جاپانیوں کی دہشت
سی بیٹھی ہوئی تھی۔ کوئی کہتا جاپانی انسانوں کا خون پی جاتے ہیں۔
کوئی کہتا جاپانی سپاہی جنگی قیدیوں کو بھون کر کھا جاتے ہیں۔ اس
قسم کی افواہوں نے لوگوں کے دلوں میں جاپانیوں کے بارے میں
بے حد خوف بٹھا رکھا تھا۔ پس لوگوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور
لوگوں نے رنگون سے بھاگنا شروع کر دیا۔

اب لوگ رنگون سے بھاگ کر جائیں بھی تو کدھر جائیں۔
رنگون سے صرف ایک دریا ایراوتی نکلتا تھا جو آگے جا کر سمندر
میں گر جاتا ہے۔ یعنی آگے سمندر تھا اور پیچھے گھنے جنگل جہاں
جاپانی سپاہی پھیلے ہوئے تھے۔ رنگون سے آخری بحری جہاز

لوگوں کو لے کر کبھی کا جا چکا تھا۔ بندرگاہ پر جتنے بھی جہاز تھے وہ سب کے سب بمباری میں تباہ ہو چکے تھے۔ اگر کوئی جہاز ہوتا بھی تو وہ خلیج بنگال میں سفر کرنے کا خوفناک خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ کیونکہ سمندر دشمن کی آبدوزوں سے بھرا ہوا تھا اور پھر جاپانیوں کی وحشیانہ بمباری کا بھی ہر لمحہ خطرہ تھا۔ مجبوراً لوگوں نے جان بچانے کی خاطر برما کے گھنے جنگلوں کا رُخ کیا۔ لوگوں کے قافلے شہروں سے نکل کر جنگلوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ اپنی جائیدادیں، مکان، بلڈنگیں، موٹر گاڑیاں، بنگلے، بنکوں میں جمع کیا ہوا روپیہ، دکانیں اور جو کچھ انہوں نے کمایا تھا سبھی کچھ پیچھے چھوڑ کر دو کپڑوں میں تن تنہا جنگلوں کی طرف چل پڑے تھے۔ اس خیال کے ساتھ کہ پیدل چل کر کبھی نہ کبھی تو اپنے وطن پہنچ جائیں گے۔

پیارے بچو! ہمارے ملک پاکستان کے سارے صوبوں کے لوگ بڑے بہادر، عالی ہمت اور جفاکش ہیں۔ یہ دُور دُور ملکوں میں جا کر کام کرتے ہیں اور بڑی سے بڑی اور سخت سے سخت محنت سے بھی نہیں گھبراتے۔ آپ دنیا کے کسی ملک میں چلے جائیں آپ کو وہاں پنجاب، سرحد، سندھ، اور بلوچستان کے لوگ ضرور مل جائیں گے۔ جتنی یہ محنت کرتے ہیں دنیا کے کسی ملک کے لوگ نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ تھی کہ رنگون میں بھی پاکستانیوں کی بڑی تعداد

موجود تھی۔ کسی نے اپنا ہوٹل کھول رکھا تھا۔ کوئی غلہ منڈی میں غلے کی تجارت کرتا تھا۔ کوئی بنک میں ملازم تھا تو کوئی برما تیل کمپنی میں محنت کر کے روزی کماتا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتا تھا۔ انہی لوگوں میں ہماری کہانی کا ہیرو عبدل بھی تھا۔

عبدل اٹھارہ اُنیس برس کا ایک نوجوان لڑکا تھا جس کی آنکھیں نیلی اور بال گھنگریالے تھے۔ وہ صوبہ پنجاب کے شہر گجرات کا رہنے والا تھا۔ ماں کی وفات کے بعد بچپن ہی میں وہ اپنے والد کے ساتھ رنگون آ گیا۔ اس کا باپ رنگون سے دس بارہ میل دُور کمائیٹ نام کے قصبے کی ایک جوتا ساز فیکٹری میں کاریگر تھا۔ دونوں باپ بیٹا اسی فیکٹری کے ایک کوارٹر میں رہتے تھے۔ عبدل جب بڑا ہوا تو اُس کا باپ بیمار رہنے لگا۔ اُس کی جگہ عبدل نے فیکٹری میں کام کرنا شروع کر دیا۔ اس کارخانے میں ربڑ کے جوتے اور ربڑ کی چپلیں تیار ہوتی تھیں۔ کرنا خُدا کا کیا ہوا کہ ایک بار عبدل کا باپ زیادہ بیمار ہو گیا۔ وہ بستر پر پڑ گیا۔ عبدل نے اپنے باپ کی بڑی خدمت کی۔ مگر جو خدا کو منظور تھا وہ ہو کر رہا اور عبدل کا باپ اللہ میاں کو پیارا ہو گیا

عبدل کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ وہ اپنے باپ کی موت پر بہت رویا۔ فیکٹری کے دوسرے کاریگروں نے اُسے حوصلہ دیا۔ فیکٹری کے مالک نے عبدل کو اُس کے باپ کی جگہ پر رکھ لیا اور اُس کی تنخواہ بھی

بڑھا دی۔ عبدل دن بھر بڑی محنت سے فیکٹری میں کام کرتا اور
شام کو اپنے کوارٹر میں آکر پڑھائی کرتا۔ اُس کا ارادہ تھا کہ وہ گھر
پر پڑھ کر میٹرک کا امتحان دے گا۔ اُن ہی دنوں دوسری جنگِ عظیم
چھڑ گئی۔ فیکٹری میں کام بڑھ گیا۔ اُسے رات کی شفٹ میں بھی
کام کرنا پڑتا۔ جنگ شروع ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ
جاپان بھی میدانِ جنگ میں کود پڑا۔ اب تو جنگ کے خوفناک
بادل برما پر بھی منڈلانے لگے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا ہم اس
سے پہلے بیان کر چکے ہیں کہ رنگون پر جاپانیوں کے ہوائی حملے
قیامت کی شکل اختیار کر گئے۔ جاپانی رنگون کے آس پاس پہنچ گئے
اور لوگوں نے رنگون سے قافلوں کی صورت میں ہجرت شروع کر دی۔

عبدل بھی ایک قافلے کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اس روز رنگون
پر جاپانیوں نے اندھا دھند بمباری کی۔ عبدل رنگون سے فرار ہونے
سے پہلے قبرستان میں اپنے باپ کی قبر پر گیا۔ آخری بار فاتحہ پڑھ
کر باپ کی رُوح کو ثواب پہنچایا۔ ایک قافلہ جس میں سینکڑوں عورتیں
بچے، بوڑھے اور جوان شریک تھے کمائیٹ قصبے کی بڑی سڑک پر
سے گذر رہا تھا۔ عبدل نے کچھ روپے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب
میں رکھے اور قافلے والوں کے ساتھ مل گیا۔ یہ قافلہ بھی دوسرے
قافلوں کی طرح پنجاب کی طرف جا رہا تھا۔ لیکن اپنی اپنی منزل کی
طرف جانے والے ان لوگوں کو اس بات کا بالکل احساس نہیں تھا کہ

انہیں کیسے کیسے خوفناک جنگلوں اور دشوار گذار پہاڑوں پر سے
گذرنا پڑے گا۔ ابھی یہ قافلہ رنگون شہر کی قریبی بستیوں سے نکل کر
دھان کے کھیتوں میں ہی پہنچا تھا کہ اچانک جاپانی بمبار طیارے
اُن کے سروں پر آ گئے۔ جہازوں نے اُوپر ہی اُوپر آسمان پر چکر
لگائے۔ پھر ایک طرف غوطہ کھا گئے۔ غوطہ کھانے کے چند ہی
سیکنڈ بعد ایک جانب بڑے زوروں کے دھماکے ہوئے۔ اور
ساتھ ہی آسمان سرخ اور نیلے رنگ کے شعلوں سے روشن ہو گیا۔
قافلے میں بھگدڑ سی مچ گئی۔ کچھ لوگ رنگون کی طرف، کچھ کمائیٹ
کی طرف اور کچھ آگے کو نکل گئے۔ اُن کا خیال تھا کہ جاپانی طیارے
ان پر بھی بم برسائیں گے۔ مگر انہوں نے ایسا نہ کیا۔ وہ تیل کے
کنوؤں میں آگ لگا کر واپس چلے گئے۔ بچے کھچے لوگوں نے ایک
بار پھر قافلے کی شکل میں جمع ہو کر برما کے جنگلوں کی طرف سفر کرنا
شروع کر دیا۔

اس سے پہلے کہ ہم آپ کو عبدل کے ساتھ لے کر برما کے
گھنے جنگلوں میں داخل ہوں۔ پہلے یہ ضروری ہے کہ آپ کا ان
جنگلوں سے تھوڑا سا تعارف کروا دیا جائے۔

برما کے جنگل دنیا کے گنجان ترین جنگلوں میں سے ہیں۔ یہاں
درختوں کا گھن اتنا زیادہ ہے کہ دن کے وقت بھی سورج کی کرنیں
یہاں نہیں پہنچ سکتیں۔ جنگل میں اکثر جگہوں پر اندھیرا چھایا رہتا

ہے۔ پھر ان جنگلوں میں ایسے درخت بھی ہیں جو انسان کا خون پیتے
ہیں۔ اگر کوئی شخص ان کے ساتھ لگ کر گذرے تو اس کے پتے اور
ٹہنیاں اُسے اپنے شکنجے میں جکڑ لیتی ہیں اور ان کا خون چوسنا شروع
کر دیتی ہیں۔ ان جنگلات میں ہاتھی، شیر، چیتے، بھینسے اور دوسرے
خطرناک جنگلی درندے عام پائے جاتے ہیں۔ برما کا شیر اور ہاتھی تو
ساری دنیا میں مشہور ہے۔ یہ ہاتھی ویسے تو کسی آدمی کو کچھ نہیں کہتا
لیکن اگر کسی بات پر اُس پر مستی سوار ہو جائے یا وہ نیم پاگل ہو
جائے تو اُس سے زیادہ خطرناک اور کوئی جانور نہیں ہوتا۔ وہ درختوں
کو جڑوں سے اُکھاڑ دیتا ہے۔ کسی آدمی کی شکل دیکھ لے تو اس کے
پیچھے بڑی تیز رفتاری سے دوڑتا ہے اور جب تک اُسے ہلاک نہ
کر دے اُسے چھوڑتا نہیں۔

یہ جنگل بڑے بڑے اژدہا اور سانپوں سے بھی بھرے ہوئے
ہیں۔ دھاگے جتنے باریک سانپ سے لے کر پُرانے درخت کے
تنے جتنے موٹے سانپ یہاں پائے جاتے ہیں۔ پتلے اور باریک
سانپوں کا رنگ سبز ہوتا ہے۔ وہ ٹہنیوں کے ساتھ لٹکے رہتے ہیں
اور یہی معلوم ہوتا ہے جیسے درخت کی ڈالیوں کے ساتھ جنگلی بیلیں
لٹک رہی ہوں۔ یہاں کالے ناگ بھی عام پائے جاتے ہیں۔ وہ
جب پھن پھیلا کر اپنی پتلی پتلی دو شاخ زبان باہر نکالتے ہیں تو
اُن کی سسکار سُن کر پرندے سہم جاتے ہیں۔ ایسے اژدہا ہوتے

ہیں کہ زندہ بکرے کو نگل جاتے ہیں۔ ایک پھنکار مار کر جھاڑیوں
میں آگ لگا دیتے ہیں۔ ان جنگلوں میں جگہ جگہ دلدلیں پائی جاتی ہیں۔
یہ اُوپر سے دیکھنے پر گھاس کا سرسبز میدان لگتی ہیں۔ لیکن ذرا اس
میں پاؤں پڑا اور اس نے انسان اور جانور کو دیکھتے دیکھتے سالم کا سالم
اندر نگل لیا۔ جنگل میں رہنے والے قبیلے اِن دلدلوں سے بڑی احتیاط
برتتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی بھولا بھٹکا آدمی اس میں پھنس جائے تو پھر
وہ زندہ بچ کر نہیں جا سکتا۔

جاپانیوں کے حملے کے بعد قافلے میں ہزار کے قریب لوگ رہ
گئے تھے۔ ان میں زیادہ تر عورتیں اور مرد تھے۔ بچوں اور عورتوں کی
تعداد کم تھی۔ اِن بچوں اور عورتوں کو گڈّوں پر سوار کرا رکھا تھا۔
مرد ساتھ ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ گڈّوں کے آگے بھینسے جُتے
ہوئے تھے۔ قافلہ دھان کے کھیتوں کے بیچوں بیچ آہستہ آہستہ
آگے روانہ ہو گیا۔ قافلے میں کچھ لوگ اُس قصبے کے بھی تھے جہاں
عبدل نے اپنے باپ کے ساتھ زندگی کے چند ایک اچھے دن گذارے
تھے۔ ان میں ایک رحمت بابا بھی تھے۔ رحمت بابا ضلع ہزارہ
کے رہنے والے تھے۔ وہ جوانی میں ہی برما آ گئے تھے اور
کمائیٹ میں غلّے کا کام کرتے تھے۔ وہ برمی زبان بڑی اچھی طرح
سے بول لیتے تھے۔ انہیں برما میں رہتے ہوئے کئی سال بیت
گئے تھے اور وہ برما کے جنگلی قبیلے والوں کی زبان بھی جانتے تھے۔

رحمت بابا امیر آدمی تھا لیکن اب وہ صرف تین کپڑوں میں واپس
وطن جا رہا تھا۔ اُس کی ساری دولت پیچھے رنگون میں رہ گئی تھی۔
اُس کے پاس کچھ کرنسی نوٹ، بھُنے ہوئے چنوں کا ایک تھیلہ اور
اچار کی ایک بوتل تھی۔

یہ لمبا قافلہ سات آٹھ ٹولیوں میں بٹ کر جا رہا تھا۔ ہر قافلے
میں سو کے قریب آدمی تھے۔ ہر قافلے کا ایک سردار اور نائب سردار
مقرر کر دیا گیا تھا۔ سارا راشن پانی یہ لوگ ہی قافلے کے لوگوں
میں تقسیم کرتے تھے۔ دو قافلوں کے بیچ میں ڈیڑھ ایک فرلانگ
کا فاصلہ رکھا گیا تھا۔ لیکن بہت آگے جنگل میں پہنچ کر یہ فاصلہ کئی
کئی میل کا ہو گیا اور ایک نئی مصیبت کا آغاز ہوا جو ہم آگے چل
کر آپ کو بتائیں گے۔ جس قافلے میں عبدل سفر کر رہا تھا اس کا
سردار رحمت بابا اور نائب سردار ایک پارسی ہُرمزجی تھا۔
ہرمزجی ادھیڑ عمر کا دُبلا پتلا آدمی تھا جو بہت کم کسی سے بات
کرتا۔ وہ رنگون ہی میں پیدا ہوا تھا اور دنیا میں اُس کا سوائے
اُس کی ماں کے اور کوئی نہ تھا جو کلکتے میں رہتی تھی۔ ہرمزجی اس
قافلے کے ساتھ یہ اُمید لے کر جا رہا تھا کہ وہ کلکتے میں اپنی ماں
سے جا کر ملے گا۔ لوگ اِس قافلے میں بہت سی اُمیدیں لے کر
چلے تھے مگر جیسا کہ آپ کو بعد میں معلوم ہوگا، بہت کم لوگوں کی
اُمیدیں پوری ہوئیں۔

اس قافلے میں صرف ایک چھکڑا گاڑی تھی جس پر پندرہ
بیس عورتیں اور بچے سوار تھے۔ اس چھکڑے کو دو بیل کھینچ
رہے تھے۔ کچھ برمی لوگ ساتھ کرایہ پر لے لئے تھے جو قافلے
کو راستہ دکھانے کا کام کرتے تھے۔ پانی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔
خیال یہ تھا کہ جنگل میں چشمے اور جھیلیں ضرور ہوں گی۔ جہاں پانی
ملے گا، پیاس بجھا لی جائے گی۔ اصل میں یہ سفر اچانک اور
افراتفری میں شروع ہوا تھا۔ جس کے ہاتھ جلدی میں جو لگا تھا
وہی اُٹھا کر چل پڑا تھا۔ قافلہ جُوں کی چال دھان کے کھیتوں کے
درمیان والی کچی پگ ڈنڈی پر چلا جا رہا تھا۔ عبدل کے پاؤں میں
ربڑ کے جوتے تھے اور اُس نے قمیص، ٹھنڈا کوٹ اور پرانی
پتلون پہن رکھی تھی۔ دھان کے کھیتوں کا سلسلہ بڑی دُور تک پھیلا
ہوا تھا۔ رنگون سے کاکسز بازار تک ایک طویل، خوفناک اور
دشوار گذار سفر تھا، جس کی تفصیل کا پوری طرح کسی کو بھی علم نہیں
تھا۔ صرف قافلے کے سرداروں کو اتنا بتایا گیا تھا کہ قافلہ وایا پرُوم
اکیاب اور پھر میوسے ہوتا ہوا کاکسز بازار پہنچے گا۔ کب پہنچے گا؟
کتنے دنوں میں پہنچے گا؟ اس کی کسی کو کچھ خبر نہ تھی۔ برما کے جو راہ
دکھانے والے لوگ قافلے کے ساتھ جا رہے تھے اُن کا اندازہ
تھا کہ اگر قافلہ اِسی طرح چلتا رہا اور راستے میں کسی قسم کی کوئی
دشواری یا حادثہ پیش نہ آیا تو ہم دو مہینوں میں کاکسز بازار پہنچ

جائیں گے۔ قافلے کے نائب سردار مسٹر ہرمزجی کے پاس اپنی کار بھی تھی لیکن وہ دوسرے لوگوں کی طرح اپنی کار شہر میں ہی چھوڑ آئے تھے۔ یہی حال رحمت بابا کا تھا۔ اُن کے پاس بھی اپنی دو موٹر گاڑیاں تھیں۔ مگر موٹر گاڑیوں پر سوار ہو کر جنگل کو عبور کرنا ناممکن تھا۔ انہوں نے بھی شہر میں ہی گاڑیوں کو پڑا رہنے دیا تھا۔ جو لوگ کل تک لاکھوں میں کھیلتے تھے آج وہ فقیر ہو گئے تھے۔ جنہوں نے کبھی شاندار موٹر گاڑیوں سے باہر پاؤں نہ رکھا تھا آج وہ ننگے پاؤں کھیتوں میں سے گزر رہے تھے۔

باب ۲

جنگل میں پہلی رات

سارا دن یہ قافلہ کھیتوں میں چلتا رہا۔

یہ کھیت ویران اور اُجڑے ہوئے پڑے تھے۔ جاپانی بمباروں کی وحشیانہ بمباری نے ہر طرف ایک تباہی پھیلا رکھی تھی۔ درخت جڑ سے اکھڑے ہوئے تھے۔ کسانوں کی جھونپڑیاں جل کر راکھ ہو گئی تھیں۔ یہ قافلہ تیل کے ذخیروں سے بچ کر جا رہا تھا۔ برمی لوگ جو قافلے کو راہ دکھا رہے تھے۔ انہوں نے خاص طور پر یہ انتظام کیا تھا کہ ایسے راستوں سے گزرا جائے جو تیل کی پائپ لائن سے کافی فاصلے پر ہوں۔ کیونکہ جاپانیوں کے جہاز ابھی تک تیل کے ذخیروں پر بم برسا رہے تھے۔ دن کے دس بجے انہوں نے مشرق کی طرف تیل کے کنوؤں پر جو تازہ حملہ کیا تھا اُس کی آگ ابھی تک دُور سے نظر آ رہی تھی۔ تیل کے یہ کنوئیں دریائے ایراوتی کے ساتھ ساتھ دُور تک چلے گئے تھے۔

شام ہونے لگی تو کھیتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور سامنے برما کے گنجان جنگلوں کا سلسلہ منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ بہت کم لوگوں کو علم تھا کہ وہ کس قدر بھیانک جنگلوں میں داخل ہو رہے ہیں۔ ہر ایک

کا بھی خیال تھا کہ وہ اسی طرح چلتے ہوئے بڑی آسانی سے جنگلوں
کو عبور کر جائیں گے۔ قافلہ جس پہلے جنگل میں داخل ہوا یہ بانس اور
سپاری کے اونچے اونچے گھنے درختوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس
جنگل میں ابھی کٹائی وغیرہ کا کام شروع ہوا ہی تھا کہ جاپانیوں کے
حملے شروع ہو گئے۔ ٹھیکیدار اور مزدور کام چھوڑ کر بھاگ گئے۔
چنانچہ جگہ جگہ کٹی ہوئی لکڑیاں اور بانس کے بڑے بڑے گٹھے پڑے
تھے۔ ایک جگہ کچھ خالی جھونپڑیاں بھی تھیں۔ ان جھونپڑیوں کو دیکھ
کر فیصلہ کیا گیا کہ رات اسی جگہ بسر کی جائے۔

اس اعلان کے ساتھ ہی قافلہ رک گیا۔ چھکڑے روک دیئے
گئے۔ عورتوں اور مردوں نے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں میں جا کر
چادریں بچھا دیں۔ جن کے پاس تھوڑا بہت آٹا چاول ساتھ تھا
انہوں نے اِدھر اُدھر سے خشک لکڑیاں جمع کر کے آگ سلگا لی۔
رحمت بابا اور ہرمزجی نے چل پھر کر سارے قافلے والوں سے
ملاقات کی۔ ہر ایک سے پوچھا کہ کسی کو کوئی شکایت تو نہیں ہے۔
اس کے بعد وہ اپنی جھونپڑی میں آ گئے۔ عبدل بھی انہی کی جھونپڑی
میں ٹھہرا ہوا تھا۔ عبدل نے چولہا جلا کر کیتلی میں چائے بنا کر سب
کو پلائی۔ چائے کے ساتھ تینوں نے مل کر ڈبل روٹی کے دو چار
ٹکڑے کھائے اور رنگون کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ انہیں
ابھی تک یہی ڈر تھا کہ جاپانی جاتے جاتے کہیں اس جنگل میں ہی

بم نہ برسا جائیں۔ چنانچہ اعلان کر دیا گیا کہ جہاں جہاں آگ جل رہی
ہے اسے دس منٹ کے اندر اندر بجھا دیا جائے۔

یہ اس وجہ سے کیا گیا کہ آگ اور دھوئیں کو دیکھ کر جاپانیوں
کو کہیں یہ شک نہ ہو کہ یہاں انگریزی فوج پڑاؤ ڈالے ہوئے
ہے۔ دس منٹ کے بعد جنگ میں کہیں بھی آگ نہیں جل رہی تھی۔
کہیں بھی دھواں نہیں اٹھ رہا تھا۔ رحمت بابا اور ہرمزجی قافلے
والوں کے اِس اتفاق اور ضبط و نظم سے بڑے خوش ہوئے۔
رحمت بابا نے عبدل سے پوچھا۔

"عبدل بیٹا! تم بھوکے تو نہیں رہ گئے کیا؟"

عبدل نے مسکرا کر جواب دیا۔

"نہیں بابا۔ میں سیر ہو گیا ہوں۔"

رحمت بابا اور ہرمزجی خاموش ہو رہے۔ انہیں اچھی طرح
معلوم تھا کہ ایک نوجوان صحت مند لڑکے کا پیٹ جو کہ صبح سے
پیدل چل رہا ہو ڈبل روٹی کے دو چار ٹکڑوں سے نہیں بھر سکتا۔
لیکن وہ بھی مجبور تھے۔ اُن کے پاس بمشکل اتنا راشن تھا کہ جس
سے پندرہ بیس دن گذارہ ہو سکتا تھا۔ انہیں یہ بھی خبر نہ تھی کہ
پندرہ بیس دنوں کے بعد وہ کہاں سے کھانے پینے کا بندوبست
کریں گے۔ پھر بھی وہ عبدل کے صبر، ہمت اور استقلال سے
بہت خوش ہوئے۔ انسان اگر مصیبت کے وقت اسی طرح صبر

ہمت اور استقلال سے کام لے تو آدھی مصیبت ویسے ہی ٹل جاتی ہے۔

رات کا اندھیرا چھا گیا۔

قافلے والے چادریں وغیرہ تان کر سو گئے۔ لیکن مچھر بڑی طرح تنگ کر رہے تھے۔ یہ مچھر اتنے ظالم اور بڑے تھے کہ چادروں کے باہر سے بھی کاٹ رہے تھے۔ عبدل گھر سے چلتے ہوئے ایک بڑا میز پوش ساتھ اُٹھا لایا تھا۔ رحمت بابا اور ہرمُزجی نے بھی چادریں تان رکھی تھیں۔ عبدل میز پوش اُوپر کئے جھونپڑے کے برآمدے میں لکڑی کے فرش پر پڑا تھا۔ مچھر اُسے بھی بہت تنگ کر رہے تھے۔ لیکن وہ دن بھر کا تھکا ہوا تھا۔ لیٹتے ہی اُس کی آنکھ لگ گئی۔

خدا جانے وہ کتنی دیر سویا ہوگا کہ اُس کی آنکھ کھل گئی۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی جھاڑیوں میں حرکت کر رہا ہے۔ عبدل پہلے تو ڈر گیا۔ لیکن پھر اُس نے اپنے آپ کو حوصلہ دیا اور چادر منہ پر سے ہٹا کر ایک آنکھ کھول کر جھاڑیوں کی طرف دیکھا۔ آسمان پر تاروں کی ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور جھینگر بول رہے تھے۔ اسے جھاڑیوں میں پہلے پہل کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ مگر جب اُس نے غور سے دیکھا تو دو سُرخ سُرخ چمکیلی آنکھیں اُسے اپنی جانب گھورتی ہوئی نظر آئیں۔ اُس نے آہستہ سے ایک ہاتھ چادر

سے باہر نکال کر ہرمُزجی کو جگایا۔

"کیا ہے؟" ہرمُزجی نے چونک کر کہا۔

عبدل نے آہستہ سے کہا۔

"جھاڑیوں میں شیر ہے"۔

"شیر!" ہرمُزجی نے چیخ ماری اور رحمت بابا ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔

"کیا بات ہے؟"

"شیر! شیر!"

ہرمُزجی کی گھگھی بندھ گئی تھی۔ عبدل کو اب محسوس ہوا کہ وہ بے چارا بے حد ڈرپوک آدمی ہے۔ رحمت بابا نے کہا۔

"کہاں؟"

عبدل نے چپکے سے جھاڑیوں کی طرف اشارہ کیا۔ رحمت بابا ایک بہادر انسان تھا۔ اُس نے آہستہ سے چادر پرے ہٹائی۔ دیوار کے ساتھ لگا کر رکھی ہوئی کلہاڑی اُٹھائی اور عبدل سے کہا۔

"میرے ساتھ آؤ۔ شور ہرگز نہ کرنا۔ پاؤں کی آہٹ بھی نہ ہو"۔

عبدل نے بھی اپنی کلہاڑی اٹھا لی۔ ہرمُزجی جھونپڑی کے اندر جا کر دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور رحمت بابا اور عبدل کلہاڑیاں ہاتھ میں لئے جھونپڑی کی طرف بڑھنے لگے۔ انہوں نے جھونپڑی

کے پاس جاکر ایک پتھر اندر پھینکا۔ جھاڑیوں میں "چاؤں" کی آواز پیدا ہوئی اور ایک کتا وہاں سے نکل کر بھاگ گیا۔

عبدل اور رحمت بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ اُن کے ہنسنے کی آواز سُن کر ہرمزجی بھی جھونپڑی سے باہر آگیا۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ جس درندے کو وہ شیر سمجھ رہے تھے وہ جنگلی کتا تھا تو وہ بھی کھسیانی سی ہنسی ہنسنے لگا اور بولا۔

"میں تو خوامخواہ ڈر رہا تھا۔ اچھا اب کے شیر آیا تو سب سے پہلے میں اُس پر وار کروں گا۔"

رحمت بابا نے کہا۔

"ہرمزجی! تم بے شک وار نہ کرنا لیکن خدا کے لیے شور کبھی نہ مچانا۔ شور سُن کر نہ صرف جانور بوکھلا کر حملہ کر دیتا ہے بلکہ انسان بھی گھبرا جاتا ہے۔"

"رحمت بابا! تم فکر نہ کرو۔ میں اب کبھی شور نہیں مچاؤں گا۔ مجھے اگر پہلے معلوم ہوتا کہ جسے میں شیر سمجھ رہا ہوں وہ جنگلی کتا ہے تو میں کبھی شور نہ مچاتا۔"

"بہرحال اب ہمیں آرام کرنا چاہیئے۔ ابھی کافی رات باقی ہے۔"

اتنا کہہ کر رحمت بابا چادر تان کر لیٹ گیا۔ عبدل اور ہرمزجی بھی لیٹ گئے۔ ابھی رات آدھی باقی تھی۔ یہ بھی ایک طرح سے اچھی بات ہوئی تھی کہ باقی قافلے والے نہیں جاگے تھے۔ ورنہ ہو سکتا

تھا کہ شیر شیر کی آوازیں سُن کر اُن میں افراتفری مچ جاتی اور خدا جانے جنگل میں کون کس طرف بھاگ جاتا۔

آدھی رات کے بعد جانے کس وقت عبدل کی آنکھ لگی۔ صبح وہ جاگا تو دن چڑھ آیا تھا۔ سورج کی کرنیں سپاری اور دیودار کے درختوں کے بیچ میں سے چھن چھن کر زمین پر پڑ رہی تھیں۔ قافلے کے باقی لوگ پہلے ہی سے جاگے ہوئے تھے اور آگ جلا کر چائے وغیرہ بنا رہے تھے۔ دوایک جانب سے بچوں کے ضد کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ عبدل نے کیتلی میں چائے بنا کر رحمت بابا اور ہرمزجی کو دی۔ خود بھی ایک پیالی پی اور اُٹھ کر قافلے والوں کے درمیان چکر لگانے لگا۔

قافلے کے لوگ اگرچہ اپنا سب کچھ لُٹا کر رنگون اور برما کے دوسرے شہروں سے بھاگے تھے لیکن پھر بھی انہوں نے کھانے پینے کا خشک راشن گٹھڑیوں میں باندھ کر اپنے ساتھ کر لیا تھا۔ عبدل نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی کہ لوگ راشن کو بڑی بے دریغی سے استعمال کر رہے ہیں۔ اُنہیں یہ بالکل احساس نہیں ہے کہ وہ ایک ناقابلِ اعتبار لمبے سفر پر پیدل روانہ ہیں۔ کوئی خبر نہیں راستے میں انہیں پینے کو پانی بھی ملے یا نہیں۔ اُس نے واپس آکر رحمت بابا سے بات کی تو اُس نے فکر مندی سے کہا۔

"یہ بات تشویش ناک ہے۔ میں نے اِن لوگوں کو بہت سمجھایا

تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اُن پر کوئی اثر نہیں ہوا۔"

ہرمزجی نے سگریٹ جلا کر کہا۔

"اثر ہو بھی کیسے سکتا ہے چاچا۔ اُنہیں اِس قسم کے سفر کا پہلے کوئی تجربہ نہیں ہے۔ یہ لوگ رنگون کے شہر میں آرام اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اب یہ مشکل اُن پر ایکا ایکی آن پڑی ہے۔"

"پھر بھی انہیں عقل سے کام لینا چاہیئے۔"

"چاچا! عقل تو جاپانیوں کی بمباری نے مار دی ہے۔"

"ہرمزجی! انسان وہی ہے جو عقل کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ جانے دے۔ میری طرف دیکھو۔ تمہارا کیا خیال ہے میں برما میں غریب آدمی تھا؟ کیا میں نے کبھی ایسے مصیبت کے دن دیکھے ہیں؟"

"نہیں۔"

"تو پھر۔ میں کیوں تمہارے ساتھ چائے کا ایک کپ اور دو ٹکڑے ڈبل روٹی کے کھاتا ہوں۔ حالانکہ میں اگر چاہوں تو سارا راشن کھا سکتا ہوں۔ مگر میں عقل سے کام لے رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ ہم ایک خطرناک سفر پر روانہ ہیں۔ ہمیں پوری ہوشمندی اور عقل سے کام لینا ہوگا۔"

"چاچا اب اِن لوگوں کو کون سمجھا سکتا ہے؟"

"جب اِن کے پاس راشن ختم ہوگیا اور بھوکوں مرنے لگے تو

اپنے آپ عقل آ جائے گی۔"

اتنے میں قافلے کا بوڑھا برمی راہنما سوانا وہاں آگیا۔ اُس نے اپنی کمر کے ساتھ ایک کلہاڑی باندھ رکھی تھی اور سر پہ زرد رنگ کا رومال لپٹا تھا جس طرح کہ برما کے لوگ باندھا کرتے ہیں۔

اُس نے آ کر رحمت بابا سے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں شمال مشرق کی بجائے جنوب مشرق سے ہو کر اکیاب کی طرف بڑھنا چاہیئے۔ ہو سکتا ہے ہم پرودم پہنچ کر دو چار کشتیاں حاصل کر لیں۔ وہاں میرے کچھ رشتہ دار رہتے ہیں۔"

"اگر تم اِسے مناسب سمجھتے ہو تو ٹھیک ہے ہم پرودم کی طرف سے آگے بڑھیں گے۔"

ہرمزجی کہنے لگا۔

"اور اگر ہمیں وہاں کشتیاں نہ ملیں تو اس صورت میں کیا ہوگا؟"

سوانا نے کہا۔

"پرودم سے اکیاب تک پچاس میل کی ایک کھاڑی ہے۔ وہاں سے اکثر مسافر آتے رہتے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ ہمیں وہاں کشتیاں نہ ملیں۔"

رحمت بابا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"سوانا ٹھیک کہتا ہے ہرمزجی! خلیج بنگال کی اس پچاس میل لمبی کھاڑی میں اکثر لوگ سفر کرتے رہتے ہیں۔"

"پھر وہ سوانا کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے۔
"لیکن سوانا اگر ہم خشکی کے راستے چلیں تو اس میں کیا حرج ہے"؟
سوانا نے زمین پر انگلی سے نشان لگاتے ہوئے کہا۔
"حرج تو کچھ نہیں چاچا! لیکن ایک مہینے بعد برسات کا موسم شروع ہو جائے گا۔ اور برما کی برسات سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ اگر ہمیں جنگل کے راستے میں برسات آگئی تو پھر ہم ساری زندگی اس جنگل سے باہر نہ نکل سکیں گے"۔
رحمت بابا نے کہا۔
"تم ٹھیک کہتے ہو۔ بارشیں شروع ہو گئیں تو ندی نالے دریا بن جائیں گے اور ہمارے لیے انہیں عبور کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہم واپس پروم چلیں"۔
اس فیصلے کے ساتھ ہی قافلے کا رخ پروم کی طرف موڑ دیا گیا۔ سوانا نے ٹھیک وقت پہ آکر مشورہ دیا تھا۔ کیونکہ برما کی بارشوں سے انسان تو انسان جانور بھی پناہ مانگتے ہیں۔ برسات ایک بار شروع ہوتی ہے تو پھر ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ ہفتوں جھڑی لگی رہتی ہے۔ چھاجوں پانی برستا ہے۔ آسمان مہینوں بادلوں میں چھپا رہتا ہے۔ سورج ایک پل کے بھی بادلوں کا لحاف ہٹا کر باہر نہیں جھانکتا۔ جل تھل ایک ہو جاتے ہیں۔ ندی نالے دریا بن جاتے ہیں اور دریا سمندر سے جا ملتے ہیں۔ رنگون شہر میں بھی بارشوں کا یہی حال

ہوتا تھا۔ برسات کی جھڑی ایک بار لگتی تو ہفتوں لگی رہتی۔ وہ تو غنیمت ہے کہ شہر کی سڑکیں کارپوریشن نے اس ڈھب سے بنائی تھیں کہ ایک پل کے لیے بھی پانی کھڑا نہیں ہوتا تھا۔ مگر جنگلوں میں ایسا کوئی انتظام نہیں ہو سکتا تھا۔ وہاں تو ہر طرف پانی ہی پانی بھر جاتا۔ سانپ اپنے بلوں سے نکل کر درختوں پر بسیرا کر لیتے اور شیر اپنی کچھاروں سے نکل کر اوپر پہاڑوں کی راہ لیتے۔
سورج نکلنے کے تھوڑی ہی دیر بعد قافلہ پروم کی سمت روانہ ہو گیا۔
جنگل اتنا دشوار گزار نہیں تھا۔ اس لیے کہ جنگ سے پہلے یہ جنگل آباد تھا۔ ٹھیکیداروں نے یہاں لکڑی کی کٹائی اور چرائی کرنے والے مزدوروں کے لیے جھاڑیاں اور درخت کاٹ کر پتلی پتلی سڑکیں بنا رکھی تھیں۔ یہ قافلہ اسی قسم کی ایک کچی سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ سب سے آگے مرد تھے۔ بیچ میں عورتوں اور بچوں کے دو چھکڑے تھے اور سب سے آخر میں پھر مرد پیدل چل رہے تھے۔ دوپہر کے بعد تک یہ قافلہ چلتا رہا۔ پھر ایک جگہ پل بھر کے لیے پڑاؤ کیا۔ آگ جلا کر لوگوں نے تھوڑا بہت کھایا پیا اور قافلہ دوبارہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

باب ۳

ہاتھی آگیا

جنگل میں یہ کچا راستہ اب تنگ ہونے لگا تھا۔

کچھ میل آگے جا کر یہ راستہ ایک سرسبز و شاداب ٹیلے کے پیچھے گھوم گیا۔ اب ایک طرف گہری کھائی تھی اور ایک جانب پہاڑ کی چوٹی۔ قافلہ اس خطرناک سڑک پر تھوڑی دُور ہی گیا تھا کہ اچانک رُک گیا۔ عبدل سب سے پیچھے رحمت اور ہرمزجی کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اتنی دیر میں سوانا بھاگتا ہوا آیا اور بولا۔

"ایک جنگلی ہاتھی نے راستہ روک لیا ہے۔"

"وہ کیسے سوانا؟" ہرمُزجی نے پوچھا۔

"وہ پگ ڈنڈی کے بیچ میں آکر بیٹھ گیا ہے۔ جب تک وہ وہاں سے اُٹھتا نہیں قافلہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔"

عبدل، رحمت بابا اور ہرمُزجی۔ سوانا کو ساتھ لے کر قافلے کے اگلے سرے کی سمت چل پڑے۔ وہاں آکر انہوں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا دیوقامت ہاتھی جس کے بڑے بڑے دانت تلواروں کی طرح اُس کے منہ سے باہر نکلے ہوئے تھے، کچے راستے پر پھسکڑا مار کر بیٹھا ہے اور بڑے مزے سے اپنے سر کو جھُولا

جُھلا رہا ہے۔ ہرمزجی نے چونک کر کہا۔

"ارے یہ تو مست ہاتھی ہے؟"

"تمہیں کیسے پتہ چلا؟" رحمت بابا نے پوچھا۔

"دیکھتے نہیں چاچا وہ جھوم رہا ہے۔" ہرمزجی نے فکرمند ہو کر کہا۔

اس پر سوانا ذرا سا مسکرا کر بولا۔

"ہرمُز بھائی! اگر یہ ہاتھی مست ہوتا تو اس وقت تک یہ کتنے ہی آدمیوں کو ہلاک کر چکا ہوتا۔ مست ہاتھی تو اندھا ہوتا ہے۔ اُس کے سامنے جو بھی آئے وہ اُس پر حملہ کر کے ہلاک کر ڈالتا ہے۔"

"پھر یہ مستی سے جھوم کیوں رہا ہے؟"

سوانا بولا۔

"اصل میں یہ ہمارے ساتھ کھیل رہا ہے۔ شرارت کر رہا ہے۔ اِس کو معلوم ہے کہ ہمیں اس سڑک پر سے ہو کر آگے گزرنا ہے۔ یہ جان بُوجھ کر یہاں راستہ روک کر بیٹھ گیا ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"محض کچھ دیر کے لیے ہمیں تنگ کرنے کے لیے۔"

"کمال ہے بھئی۔ بھلا یہ بھی کوئی تنگ کرنے کا وقت ہے؟"

ہرمزجی ہاتھی کی اس بچوں ایسی حرکت سے بڑا پریشان ہو گیا تھا۔ اُس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ ہاتھی اتنا بڑا جانور

ہو کر یہ یوں ایسی حرکت کیوں کر رہا ہے۔ سوانا نے اُسے بتایا کہ
ہاتھی جب تک مست نہ ہو جائے وہ کسی کو کچھ نہیں کہتا۔ وہ ایک
بھولا بھالا، معصوم اور انتہائی سمجھ دار جانور ہے۔ وہ انسان کا بہت
جلد دوست بن جاتا ہے اور اُس کی ایک ایک بات اور ہر ایک
اشارے کو بخوبی سمجھتا ہے اور اُس کے اشارے پر عمل کرتا ہے۔

ابھی وہ یہ باتیں ہی کر رہے تھے کہ اچانک ہاتھی زور سے چنگھاڑا
اور اپنی سونڈ اُوپر اٹھا کر چاروں طرف یوں گھمانے لگا جیسے کچھ
سونگھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ سوانا ایکدم چونک کر بولا۔

"ہاتھی نے کسی خطرے کو محسوس کیا ہے۔ یقیناً آس پاس شیر
چیتا یا کوئی دوسرا درندہ موجود ہے۔ لوگوں کو پیچھے ہٹا لیجیے"۔

اس کے ساتھ ہی لوگوں کو پیچھے ہٹا لیا گیا۔ قافلے کے سارے
آدمی پیچھے ہٹ کر عورتوں کے چھکڑوں کے اِردگرد جمع ہو گئے۔
اس دوران میں ہاتھی اُسی طرح راستے پر چوکڑی مارے بیٹھا رہا اور
بار بار اپنی سونڈھ اُوپر اُٹھا ہوا میں کچھ سونگھنے کی کوشش کرتا
رہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پہاڑ کی بائیں جانب کی جھاڑیوں میں سے ایک
سیاہ کالا بھاری بھرکم ریچھ نمودار ہوا۔ ہاتھی چنگھاڑ کر اُٹھ کھڑا
ہوا۔ ریچھ بھی انہی پیروں پر کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ خطرہ ریچھ
نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ مگر اب وہ ہاتھی کے بالکل ہی سامنے آ
گیا تھا۔ ریچھ بہادر جانور نہیں۔ وہ ایک ضدی درندہ ہے۔ وہ

ضد میں آکر مقابلے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اور ہوا بھی یہی۔
اسے معلوم تھا کہ ہاتھی اُس سے کئی گنا طاقتور ہے۔ مگر اس کے
باوجود وہ حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ ہاتھی بھی اپنی جگہ پر چوکس
ہو گیا اور اپنی سونڈھ زور زور سے ہلانے لگا۔ عبدل، رحمت بابا
ہرمزجی، سوانا اور قافلے کے دوسرے لوگ ہاتھی اور ریچھ کے
اس مقابلے کو بڑی پریشانی کے عالم میں دیکھ رہے تھے۔ سوانا کو ایک
ہی خطرہ تھا کہ مقابلے میں جو بھی جیتا وہ ہو سکتا ہے قافلے والوں
پر بھی حملہ کر دے۔ اگر ہاتھی نے ریچھ کو ہلاک کر دیا تو وہ یقیناً خود
بھی زخمی ہو چکا ہو گا۔ ایسی حالت میں کوئی عجب بات نہیں تھی کہ
ہاتھی قافلے پر حملہ آور ہو جائے۔ اُس نے رحمت بابا سے کہا۔

"اگر ہاتھی یا ریچھ نے ہم پر حملہ کیا تو ہمیں بھاگنے کی بجائے
کلہاڑیوں سے اس کا مقابلہ کرنا ہو گا۔ بھاگنے کی صورت میں درندہ
نڈر ہو جاتا ہے اور پھر وہ بہت زیادہ خونخوار ہو جاتا ہے"۔

رحمت بابا نے کہا۔

"فکر نہ کرو سوانا! ہم ڈٹ کر مقابلہ کریں گے"۔

اِدھر یہ باتیں ہو رہی تھیں اور اُدھر ریچھ نے بجلی ایسی
پھرتی کے ساتھ ہاتھی کے عقب میں جا کر اُس پر حملہ کر دیا۔
بھاری بھرکم ہاتھی کو پہلے تو محسوس ہی نہ ہو سکا کہ ریچھ اُس کی
پیٹھ پر سوار ہو کر اُس کی پشت پر اپنے چھریوں ایسے تیز پنجے

چلا رہا ہے۔ پھر ایکا ایکی ہاتھی زور سے چنگھاڑا۔ اس کی تکلیف
چنگھاڑ سے سارا جنگل گونج اُٹھا۔ اُس نے اپنی سونڈ کے لٹھ کو
زور سے گھمایا اور اپنی پیٹھ پر مارا۔ مگر ریچھ اُس کی پہنچ سے
باہر تھا۔ ہاتھی کی سونڈ ریچھ تک نہ پہنچ سکی تھی۔ اب ہاتھی نے
اپنے جسم کو ایک زوردار جھٹکا دیا جس کے ساتھ ہی ریچھ دھپ
سے زمین پر آن گرا۔ اب ہاتھی نے ریچھ کو اپنی سونڈ میں دبوچنے
کی کوشش کی۔ لیکن مکار ریچھ پہلو بچا گیا اور تیزی سے پنجہ
ہاتھی کی سونڈ پر مارا۔ اگر یہ پنجہ ہاتھی کی سونڈ سے ٹکرا جاتا تو
یقیناً اُس کی سونڈ دو حصوں میں کٹ جاتی۔ یہ ہاتھی کی خوش قسمتی
تھی کہ ریچھ کا بھرپور پنجہ اُس کی سونڈ سے ایک فٹ کے فاصلے
پر پڑا۔

ہاتھی پریشان ہو گیا تھا کہ یہ کس قسم کے کمینہ خصلت درندے
سے واسطہ پڑ گیا ہے۔ اُدھر ریچھ اب ہاتھی کے پیٹ سے چمٹا
اُس کا پیٹ پھاڑنے کی کوشش میں اپنے خونخوار ناخنوں والے
پنجے چلا رہا تھا۔ ہاتھی نے ایک بار پھر بڑے زور سے اپنے بھاری
بھرکم جسم کو جنبش دی اور ایک بار پھر ریچھ دس فٹ کے فاصلے
پر جا گرا۔ ہاتھی لپک کر آگے بڑھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے
بھاری بھرکم پاؤں کے نیچے ریچھ کو کچل دے مگر مکار ریچھ نے
ہاتھی کو اتنا موقع ہی نہ دیا۔ وہ ایک دم جھنجلا کر اُٹھا اور

ہاتھی کے گرد چکر کاٹنے لگا۔ وہ بھی زور زور سے غرّا رہا تھا۔ قافلے
کے لوگ دُور کھڑے سہمے ہوئے ہاتھی اور ریچھ کا مقابلہ دیکھ رہے
تھے۔ یہ اُن کی زندگی کا بھی پہلا موقع تھا کہ اصلی جنگل میں دو خونخوار
درندوں کو ایک دوسرے سے لڑتا ہوا دیکھیں۔ ہاتھی ریچھ کو اپنی
سونڈ کی لپیٹ میں لینے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ مگر مکار ریچھ
ہر بار اُس سے بچ کر نکل جاتا تھا۔ وہ برابر ہاتھی کے اردگرد چکر
کھا رہا تھا اور شاید حملہ کے لیے کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔
آخرکار اُسے موقع مل گیا۔ ایک بار جو ہاتھی نے ذرا سا جھک کر ریچھ
کو اپنی سونڈ کی زد میں لینے کی کوشش کی تو ریچھ لپک کر ہاتھی کی
گردن پر سوار ہو گیا اور دھڑا دھڑ اُس کی موٹی گردن پر اپنے
نوکیلے پنجے چلانے لگا۔ ہاتھی نے ایک المناک چیخ ماری۔ سارا
جنگل اُس کی چیخ سے گونج اُٹھا اور پرندے اپنی اپنی ڈالیوں سے
اُڑ گئے۔

اب کیا ہوا کہ ہاتھی ایکدم ٹھٹھک سا گیا۔ جیسے کچھ سوچ رہا
ہو۔ سوانا نے کہا۔

”ہاتھی کوئی نیا داؤ آزمانے والا ہے۔“

ریچھ ہاتھی کی گردن پر برابر اپنے نوکیلے پنجوں کی چھریاں چلا
رہا تھا۔ ہاتھی آہستہ آہستہ ایک تناور درخت کی طرف بڑھنے
لگا۔ جب وہ درخت کے بالکل قریب پہنچ گیا تو ایک پل کیلئے

رکا۔ ریچھ ہاتھی کی گردن ادھیڑنے میں مصروف تھا۔ اُسے بالکل
خبر نہیں تھی کہ ہاتھی کیا کرنے والا ہے۔ درخت کے بالکل قریب
جا کر ہاتھی نے ایکدم گردن جھکائی اور ریچھ کو درخت کے موٹے
تنے اور اپنی گردن کے بیچ میں کس دیا۔ ریچھ کی ایک آخری چیخ
بلند ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ہاتھی نے درخت کے ساتھ گردن کو
اس زور سے رگڑا کہ ریچھ کی ہڈیاں سُرمہ بن گئیں۔ ہاتھی نے درخت
سے گردن الگ کی تو ریچھ جوتے کے تلے کی طرح دھپ سے زمین
پر گر پڑا۔

ہاتھی کی گردن بھی لہولہان ہو گئی تھی۔ فتح کی خوشی میں ہاتھی سونڈ
بلند کر کے چنگھاڑا۔ سوانا کا خیال تھا کہ شاید ہاتھی قافلے والوں پر
حملہ آور ہو۔ مگر ہاتھی نے ایسا نہ کیا۔ وہ بڑے بڑے کان اور لمبی
سونڈ ہلاتا، جھومتا جھامتا جنگل میں غائب ہو گیا۔ ہاتھی کی نظروں
سے اوجھل ہوتے ہی قافلے والوں کی جان میں جان آئی۔ عورتوں،
بچوں اور مردوں کے سُکھ کا سانس لیا۔

"خدا کا شکر ہے کہ ہاتھی نے اِدھر کا رُخ نہیں کیا۔"
ہرمزجی نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ سوانا بولا۔
"یہ ہاتھی بوڑھا تھا۔ اگر جوان ہوتا تو اُس کا فتح کی خوشی میں
مستی میں آکر حملہ کرنا یقینی تھا۔"
"بہرحال اب ہمیں آگے بڑھنا چاہیئے۔ سفر طویل ہے اور ہم

نے پہلے ہی یہاں کافی دیر کر دی ہے۔"
اس کے ساتھ ہی قافلہ ایک بار پھر اپنی منزل کی طرف
چل پڑا۔

دوسری رات قافلے نے جنگل میں ایک جگہ پڑاؤ کیا۔ درمیان
میں ایک بہت بڑا الاؤ اِدھر اُدھر سے لکڑیاں جمع کر کے جلا لیا
گیا۔ ابھی دوسری رات تھی۔ لوگوں کو زیادہ تکان نہیں ہوئی تھی۔
کھانے پینے کی چیزیں بھی ابھی باقی تھیں۔ اور ویسے بھی جب سب
لوگ ایک جگہ ایک ہی مشکل میں گرفتار ہوں تو وہ مشکل نہیں
لگتی۔ رات کو الاؤ کی روشنی میں جنگل میں منگل ہو گیا۔ آگ کی تپش اور
روشنی میں درختوں پر سے پرندے اُڑ کر دوسرے درختوں پر چلے
گئے۔ جنگل میں رات کو آگ جلانا اس لیے بھی ضروری ہوتا
ہے کہ آگ کی وجہ سے جنگلی درندے پاس نہیں پھٹکتے۔ آگ سے
سبھی درندے خوف کھاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شکاری عام طور پر
رات کو جنگل میں اپنے اِردگرد آگ جلا کر سوتے ہیں۔ لیکن جنگ
کے دنوں میں آگ دشمن کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا باعث بھی بنتی
ہے۔ یعنی اُسے جلتا ہوا دیکھ کر دشمن اس طرف آ جاتا ہے۔ چنانچہ
یہی ہوا۔

جس جگہ ان لوگوں نے پڑاؤ ڈال کر آگ جلا رکھی تھی وہاں سے
تھوڑی ہی دُور ایک پہاڑی ٹیلے پر جاپانی فوج کا ایک مورچہ

تھا۔ جاپانیوں نے جو جنگل میں آگ روشن دیکھی تو حیران ہوئے۔ کیونکہ
جس سمت آگ جل رہی تھی اُدھر اُن کی فوج کا ایک بھی مورچہ نہیں
تھا۔ پس انہوں نے اُدھر مشین گن کا منہ کر کے فائرنگ کرنی شروع
کر دی۔ خاموش جنگل میں گولیوں کی آواز گونج اُٹھی اور اُس کے ساتھ
ہی قافلے والوں کے اِرد گرد تڑاتڑ گولیاں گرنے لگیں۔

"جاپانی آ گئے۔ جاپانی آ گئے.....!"

ہر طرف شور مچ گیا اور عورتوں مردوں نے الاؤ کے گرد سے
اُٹھ کر بدحواسی میں اِدھر اُدھر بھاگنا شروع کر دیا۔ رحمت بابا،
ہرمز جی، عبدل اور سوانا بھی ایک ٹیلے کی اوٹ میں چھپ گئے۔
انہوں نے بلند آواز میں سب کو پکار پکار کر کہا۔

"اِدھر اُدھر چھپ جاؤ۔ بھاگو نہیں۔ زمین پر لیٹ جاؤ۔"

مگر وہاں ایک چیخ و پکار مچی تھی۔ کوئی کسی کی نہیں سنتا تھا۔ اُدھر
جاپانی ٹیلے پر سے برابر مشین گن کا فائر کر رہے تھے۔ اُنہیں خود بھی
نہیں معلوم تھا کہ وہ کیوں گولی چلا رہے ہیں؟ یا یہ کہ وہ الاؤ دشمن
نے جلا رکھا ہے یا جنگلی لوگ بیٹھ کر آگ تاپ رہے ہیں۔ بات اصل
میں یہ تھی کہ وہ جنگ کا زمانہ تھا۔ سارے جنگل میں جاپان کے گوریلے
پھیلے ہوئے تھے۔ کسی کو کچھ خبر نہیں تھی کہ کسی کو کب کوئی گولی مار
کر ہلاک کر دے۔ کوئی آدھ گھنٹہ فائرنگ ہوتی رہی۔

اِس دوران میں رحمت بابا اور ہرمز جی نے سوانا اور عبدل

کے ساتھ مل کر الاؤ پر مٹی اور پانی ڈال کر آگ بجھا دی۔ آگ کے
بجھتے ہی جاپانیوں کی فائرنگ بھی بند ہو گئی۔ کافی دیر تک کوئی بھی
اپنی اپنی کمین گاہ سے باہر نہ نکلا۔ اس لیے کہ اب بھی تھوڑے
تھوڑے وقفے کے بعد ایک آدھ گولی چل جاتی تھی۔ اسی افراتفری کے
عالم میں ساری رات گزر گئی۔ جنگل میں صبح کی ہلکی ہلکی روشنی پھیلنے لگی۔
اب ایک ایک کر کے مرد جھاڑیوں، پتھروں اور درختوں کے پیچھے
سے باہر نکلنے لگے۔ عورتیں ایک ٹیلے کے غار میں بچوں کو ساتھ لے کر
سو گئی تھیں۔

رحمت بابا نے پہلا سوال یہ کیا کہ کسی کو گولی تو نہیں لگی؟ جب
گنتی کی گئی تو سارے مرد پورے تھے۔ کوئی شخص بھی گولی لگنے سے
ہلاک یا زخمی نہیں ہوا تھا۔ سوانا نے خیال ظاہر کیا۔

"جاپانیوں کے پہاڑیوں پر پختہ مورچے نہیں تھے۔ ہو سکتا ہے
کہ وہ جاپانی گوریلا ہوں۔ انہوں نے جنگل میں آگ روشن دیکھی اور
فائرنگ شروع کر دی۔ وہ یقیناً آگ کو بجھتے دیکھ کر یہاں سے آگے
نکل گئے ہیں۔"

ہرمز جی نے کہا۔

"ہمیں جتنی جلدی ہو سکے اس جنگل سے آگے گزر جانا چاہیے۔
ہو سکتا ہے جنگل میں اور بھی گوریلے چھپے ہوئے ہوں۔"

رحمت بابا نے اس خیال کی تائید کی۔ اس کے ساتھ ہی قافلے کو

فوری طور کوچ کا حکم دے دیا گیا۔ عورتوں اور بچوں کو جلدی جلدی ریڑوں پر سوار کرایا گیا اور یہ قافلہ جنگل کے ایک پُر پیچ راستے سے ہو کر پروم کی طرف روانہ ہو گیا۔

اب جنگل بہت گھنے شروع ہو گئے تھے۔ ایک اور فکر انگیز بات کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ اور وہ یہ تھی کہ جنگل میں کسی وقت دُور دُور فائرنگ کی آواز آ جاتی تھی۔ ہرمزجی کا خیال تھا کہ گوریلا جاپانی بچے کھچے ہندوستانی فوجیوں کو جنگل سے بھگا رہے ہیں۔ کچھ بھی ہو قافلے والوں کے لیے یہ ایک تشویش ناک بات تھی۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی جنگلی محاذ کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ عورتیں فائرنگ کی آواز سن کر سہم جاتیں اور بچے رونے لگتے یہ سلسلہ ایک ہفتے تک جاری رہا۔ دن میں چلتے اور راتوں کو پڑاؤ ڈالتے۔ اِن بے یارو مددگار لوگوں کا قافلہ کئی ندی نالے اور دریا عبور کرتا ہوا جنگل میں کافی سفر طے کر چکا تھا۔ اس دوران میں کئی بار جاپانی ہوائی جہاز اُن کے سروں پر سے اُڑتے ہوئے رنگون کی طرف جاتے دیکھے گئے۔

باب ۴

پُل پر بمباری

جاپانی بمبار جہاز جنگل کے اُوپر سے گذر کر رنگون، مانڈلے اور میمیو پر بمباری کرنے جاتے اور شور مچاتے ہوئے واپس چلے جاتے۔ ہرمزجی کا خیال تھا کہ جاپانی رنگون پر اپنی فوجیں اتار رہے ہیں۔ رحمت بابا نے کہا کہ یہ جہاز چھاتہ بردار نہیں ہیں بلکہ بمباری کرنے والے جہاز ہیں۔ ایک رات جنگل میں پڑاؤ کے دوران اُن کی اس بات پر دیر تک گفت گو ہوتی رہی کہ جب رنگون کی سرکار وہاں سے چلی گئی۔ شہری نکل کر جنگلوں میں بھاگ گئے تو پھر اب جاپانی وہاں بمباری کس لیے کر رہے ہیں؟

حالات جیسے بھی تھے بہر حال بمباری کا خطرہ ان جنگلوں پر بھی منڈلا رہا تھا۔ اس لیے کہ سوانا نے بتایا کہ یہاں بعض دریاؤں کے پُل بڑے اہم ہیں اور جاپانیوں کا خیال ہے کہ انہیں انگریز گوریلا دستے لڑائی کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ اس خیال کے پیشِ نظر ہرمزجی اور رحمت بابا نے ایسا انتظام کر دیا تھا کہ قافلے دس دس بارہ بارہ کی ٹولیوں میں ہو کر فاصلے فاصلے پر چلیں اور جس وقت جہازوں کی آواز سنائی دے تو فوراً درختوں کے نیچے لیٹ

جائیں۔ یہ قافلے والوں کی خوش قسمتی تھی کہ جاپانی بمبار جہاز بار بار اُن کے سروں پر سے گذرتے رہے لیکن انہوں نے ایک بم بھی جنگل میں نہ پھینکا۔ پھر بھی اُن کی دہشت سے بچے اور عورتیں سہم جاتیں اور اُن کی آواز سنتے ہی سب لوگ درختوں کے سایوں میں لیٹ جاتے۔

اب جنگل کا ایک ایسا علاقہ شروع ہو گیا تھا جہاں ٹیلوں اور بڑی بڑی چوڑی چکلی چٹانوں کا سلسلہ دُور تک چلا گیا تھا۔ ان چٹانوں کے درمیانی شگافوں میں گھنے درخت اُگے تھے اور کہیں کہیں چھوٹی چھوٹی گھاٹیاں سی بن گئی تھیں۔ ہرمزجی، رحمت بابا، عبدل اور سوانا قافلے کے آگے آگے چل رہے تھے۔ آہستہ آہستہ خوراک اور پانی کا ذخیرہ ختم ہوتا جا رہا تھا اور اب قافلے والوں کا انحصار زیادہ تر جنگلی پھلوں پر تھا۔ برما کے جنگلوں میں پپیتا، ناریل، مینگوستین اور جنگلی زرد کیلا عام مل جاتا ہے۔ پانی کے چشمے کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔ سب سے بڑی مشکل جو آن پڑی تھی وہ یہ تھی کہ جو قافلے ان لوگوں سے پہلے چلے تھے اور آگے آگے جا رہے تھے وہ پھلدار درختوں کو اُجاڑتے اور چشموں کا پانی کافی حد تک خشک کرتے جا رہے تھے۔ یہ لوگ بڑی دقت کے ساتھ چشمے میں اُتر کر پانی کے دو ایک ٹین حاصل کرتے۔ کیلے کے درختوں پر سے زرد گچھے غائب ہوتے۔ مجبوراً انہیں کچے کیلے

کھا کر ہی گذارہ کرنا پڑتا۔ جس کی وجہ سے کئی بچے بیمار ہو گئے۔ جس وقت یہ قافلہ سنگلاخ چٹانی سلسلے کے پاس پہنچا تو اُن کے پاس پانی کی ایک بوند بھی نہیں تھی۔ یہاں کہیں کہیں چٹانوں کی جھریوں میں سے پانی بہہ رہا تھا۔ قافلے نے یہاں ٹھنڈا میٹھا پانی پی کر اپنی پیاس بجھائی۔ پیپوں میں پانی بھرا۔ درختوں پر سے بچے کچھے ناریل جمع کئے اور آگے چل پڑا۔ سوانا نے ہوا میں نتھنے پھیلا کر کچھ سونگھتے ہوئے کہا۔

"یہاں قریب ہی دریا بہہ رہا ہے۔"

"کیا تم پہلے کبھی اِدھر آئے ہو؟" رحمت بابا نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"پھر تمہیں کیسے پتہ چلا کہ یہاں دریا ہے؟" ہرمزجی نے اعتراض کیا۔

اس پر سوانا نے نتھنے سکیڑ کر کہا۔

"ہوا میں دریا کے پانی کی بُو ہے۔"

اُس کی بات بالکل سچ نکلی۔ وہ ایک بہت بڑے ٹیلے کا چکر کاٹ کر ایک کھلے قطعے میں آئے تو سامنے ایک دریا بل کھاتا گذر رہا تھا۔ اس دریا کا پاٹ دو اڑھائی سو گز ہو گا۔ پانی گدلا اور تیز رفتار تھا۔ سب سے زیادہ خوش قسمتی کی بات یہ تھی کہ دریا پر لوہے کا ایک مضبوط پُل بنا ہوا تھا۔ رحمت بابا نے خدا کا شکر ادا کرتے

ہوئے کہا۔

"اگر دریا پر پُل نہ ہوتا تو ہم لوگوں کے لیے عورتوں اور بچوں کے ساتھ دریا پار کرنا بڑا مشکل تھا۔"

سوانا نے فکر مند ہو کر کہا۔

"یہی پُل ہمارے لیے سب سے بڑا خطرہ بھی ثابت ہو سکتا ہے۔"

"وہ کیسے؟" ہرمزجی نے پوچھا۔

"جاپانی جہاز دن میں کئی بار اُوپر سے گذرتے ہیں۔ اگر انہوں نے ہمیں پُل عبور کرتے دیکھ لیا تو وہ یقیناً بم گرا دیں گے۔"

"سوانا ٹھیک کہتا ہے ہرمزجی! ہمیں جتنی جلدی ہو سکے پُل پر سے گذر جانا چاہیئے۔"

"ٹھیک ہے۔"

اس فیصلے کے ساتھ ہی انہوں نے اعلان کر دیا کہ ہر آدمی اپنے بال بچوں کے ساتھ پُل پر سے جتنی جلدی ہو سکے گذر جائے۔ ہجرت کرنے والوں کی ٹولیاں ذرا فاصلے فاصلے پر سفر کر رہی تھیں انہوں نے ایک جگہ اکٹھے ہونا شروع کر دیا۔

ہرمزجی چلاّیا۔

"دوسروں کا انتظار نہ کرو۔ بس پُل پر سے گذرتے جاؤ۔"

لیکن وہاں بھلا کون سنتا تھا۔ جس باپ کا بیٹا پچھلی ٹولی میں

تھا اور جس بیٹے کا باپ چوتھی ٹولی میں تھا وہ کیسے کھڑے ہو کر انتظار نہ کرتا۔ جو اکیلے تھے وہ تو پُل پر سے گذر گئے اور باقی اپنے عزیزوں کا انتظار کرنے لگے۔ رحمت بابا اور سوانا بڑے سٹ پٹائے مگر وہ بے بس تھے۔ کوئی بھی شخص اپنے عزیز کو ساتھ لیے بغیر پُل عبور کرنے پر تیار نہ تھا۔

ٹھیک اُس وقت فضا میں ہوائی جہازوں کی آواز سنائی دی۔

سوانا نے آسمان کی طرف منہ اُٹھا کر کہا۔

"جس بات کا خطرہ تھا وہ ہو کر رہی۔ جاپانی بمبار آ رہے ہیں اگر انہوں نے ہمیں پُل عبور کرتے دیکھ لیا تو وہ ضرور پُل کو اُڑانے کی کوشش کریں گے۔"

ہوائی جہازوں کی آواز قریب آئی تو ہر طرف افراتفری سی پھیل گئی۔ کچھ لوگ پُل عبور کر رہے تھے۔ کچھ پُل کی ایک طرف کھڑے تھے۔ کچھ پُل کے بیچ میں پہنچے ہوئے تھے۔ عبدل پہلی ٹولی کے ساتھ پُل عبور کر چکا تھا۔ ہوائی جہاز آن کی آن میں سر پر آ گئے۔ یہ جاپان کے بمبار ہوائی جہاز تھے۔ انہوں نے جو لوگوں کے جمگھٹے پُل پر دیکھے تو بمباری شروع کر دی۔ ایک جہاز نے غوطہ لگایا اور اکٹھے چھ بم گرا دیئے۔ یہ سارے بم دریا میں گرے اور اتنے زور کے دھماکے ہوئے کہ سارا جنگل لرز اُٹھا۔ لوگ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ عورتیں اور بچے چیخنے چلانے لگے۔ جو لوگ پُل پر تھے

اُن میں سے کچھ نے واپس اور کچھ نے آگے کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔

ٹھیک اس لمحے ایک جاپانی ہوائی جہاز نے غوطہ لگایا اور تین بم ایک ساتھ گرا دیئے جو سیدھے پُل پر آ کر لگے۔ ایک قیامت خیز دھماکے کے ساتھ انسانوں کی چیخیں بلند ہوئیں اور پُل کے پرخچے اُڑ گئے۔ ہر طرف آگ اور دھواں پھیل گیا۔ پُل پر سے گذرتے ہوئے دریا میں غرق ہو کر ہلاک ہو گئے۔ عبدل پُل کی دوسری جانب تھا۔ اُس کے ساتھ جو دس بارہ آدمیوں نے پُل عبور کیا تھا وہ بمباری کے خوف سے جنگل میں جدھر مُنہ اُٹھا بھاگ گئے۔ عبدل ایک چٹان کے پیچھے چھپا یہ سارا خونیں منظر دیکھ رہا تھا۔ دریا میں لوگوں کی لاشیں تیرتی ہوئی آگے نکل گئی تھیں۔ دوسرے کنارے پر درختوں میں آگ لگ گئی تھی اور اب جاپانی جہاز نیچی پروازیں کر کے گولیاں برسا رہے تھے۔ کچھ گولیاں اُس چٹان کے ساتھ بھی آ کر ٹکرائیں جس کی اوٹ میں عبدل چھپا ہوا تھا۔

جہاز گولیاں برسا کر اُوپر کو اُٹھا تو عبدل نے چٹان کو چھوڑ کر جنگل میں ایک طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ جہاز ابھی تک گولیاں برسا رہے تھے۔ عبدل بھاگتا چلا گیا۔ اس کے پاؤں جھاڑیوں میں اُلجھ اُلجھ کر زخمی ہو گئے۔ اس کی پتلون پھٹ گئی۔ مگر وہ ایک پل کے لیے بھی نہ رکا اور بھاگتا ہی چلا گیا۔ آخر جب وہ بے حد

تھک گیا تو ایک بہت بڑے درخت کی اوٹ میں لیٹ کر ہانپنے لگا۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ ایک پل میں کیا سے کیا ہو گیا۔ ابھی وہ قافلے والوں کے ساتھ ہنستا کھیلتا پُل عبور کر رہا تھا اور اب اُن کی لاشیں دریا میں بہہ رہی ہیں اور وہ جنگل میں بالکل اکیلا رہ گیا ہے۔ کافی دیر بعد جب عبدل کی طبیعت ٹھیک ہوئی تو اُس نے اِرد گرد کا جائزہ لیا۔ یہاں بانس کے جنگل اتنے گھنے تھے کہ سورج کی روشنی بہت تھوڑی زمین تک پہنچ رہی تھی۔ ایک چھوٹی سی پگڈنڈی جنگل کے اندر چلی گئی تھی۔ عبدل نے اللہ کا نام لیا اور اُس پگ ڈنڈی پر چلنا شروع کر دیا۔

یہاں درخت بے حد گھنے تھے اور ساتھ ساتھ اُگے ہوئے تھے۔ کافی دُور چلنے کے بعد بانس کے درختوں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور اُس کی جگہ دیودار اور مہاگنی کے عظیم الشان کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ عبدل اِن جنگلوں اور درختوں سے بالکل بے خبر تھا۔ ایک جگہ اُس نے بہت بڑے سانپ کو درخت کے ٹہن کے ساتھ لپٹے ہوئے دیکھا۔ عبدل پہلے تو ڈرا لیکن پھر یہ سوچ کر کہ اگر اُس نے ہمت سے کام نہ لیا تو وہ اس جنگل سے باہر نہ نکل سکے گا، وہ دوسری طرف سے ہو کر آگے نکل گیا۔

جس پگ ڈنڈی پر سے گذرتا ہوا وہ جنگل میں داخل ہوا تھا اب وہ غائب ہو گئی تھی اور اب وہ اُونچی نیچی جنگلی جھاڑیوں

میں سے ہو کر آگے بڑھ رہا تھا۔ جو بات عبدل کو سب سے زیادہ پریشان کر رہی تھی وہ یہ تھی کہ اُسے بالکل معلوم نہیں تھا کہ وہ کِدھر کو چلا جا رہا ہے؟ آیا وہ ٹھیک راستے پر آگے سفر کر رہا ہے یا واپس رنگون کی طرف جا رہا ہے۔ اسے کوئی خبر نہ تھی۔ بس اللہ کے سہارے اور اپنی ہمت کے بَل پر وہ خدا کو یاد کرتا قدم قدم آگے بڑھ رہا تھا۔ اب ہوائی جہازوں کی آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں۔ جاپانی جہاز بمباری کر کے پُل اُڑا کر اور قافلے والوں کو دریا میں غرق کر کے جا چکے تھے۔

اب ہر طرف خاموشی تھی۔ جنگل میں کسی وقت کسی پرندے کی آواز گونج جاتی۔ عبدل چلتے چلتے تھک گیا۔ مگر وہ رُکنا نہیں چاہتا تھا۔ رُک کر وہ کرے گا بھی کیا؟ شام ہونے کو آئی تو اُسے بھوک اور پیاس نے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ اُس نے اِردگرد درختوں کو دیکھا۔ وہاں ایک بھی درخت ایسا نہیں تھا جسے کوئی پھل لگا ہو۔ پانی کی کوئی چھوٹی سی تال تلیا بھی دکھائی نہ دیتی تھی۔

چاروں طرف گھن دار خوفناک درخت تھے اور سناٹا تھا اور جنگلی جھاڑیاں تھیں۔ عبدل نے ایک جگہ بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کے حضور میں دُعا کی اور اس سے مدد مانگی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اُس نے اُن قافلے والوں کے لیے بھی دُعا مانگی جو بمباری سے شہید ہو گئے تھے۔ دُعا مانگ کر اُس نے محسوس کیا کہ اُس کے

اندر نئی طاقت اور توانائی آگئی ہے۔ اُسے بھوک اور پیاس پہلے سے کم محسوس ہو رہی تھی۔ وہ چلتا رہا۔

شام ہوتے ہی جنگل میں جیسے رات کا اندھیرا پھیل گیا۔ ہر طرف تاریکی سی چھا گئی اور سوائے درختوں کے موٹے موٹے تنوں کے ہر شے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اب عبدل اندھیرے میں آگے بڑھتے ہوئے گھبرانے لگا۔ اُس نے سوچا کسی درخت پر چڑھ کر رات بسر کرنی چاہیئے۔ مصیبت یہ تھی کہ اردگرد جتنے بھی درخت تھے اُن کے تنے نیچے سے اُوپر تک بہت موٹے کھمبے کی طرح بالکل سپاٹ اُوپر تک چلے گئے تھے اور بہت اُوپر جا کر شاخیں پھٹتی تھیں۔ پھر بھی عبدل کے لیے ضروری تھا کہ زیادہ اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے کسی اُونچے درخت پر چڑھ کر پناہ لے لے۔ کیونکہ اُس نے رحمت بابا سے سُن رکھا تھا کہ جنگل میں درندے یعنی شیر چیتے ہاتھی رات ہی کو اپنی خوراک اور شکار کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ وہ اندھیرے میں پھونک پھونک کر قدم اُٹھاتا آگے چلتا رہا۔ آخر اُسے ایک درخت مل گیا۔ اُس نے ربڑ کے جوتے اُتار کر کوٹ کی جیبوں میں رکھے اور تھوڑی سی جدوجہد کے بعد درخت پر چڑھ کر ایک بہت بڑی شاخ کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

باب ۵

جاپانیوں کی قید میں

عبدل نے درخت پر جھاڑیاں اور ٹہنیاں وغیرہ توڑ کر اتنی جگہ بنالی تھی کہ جہاں وہ رات کو آرام کر سکے۔ پھر بھی اُسے ڈر تھا کہ کہیں سوتے میں وہ نیچے نہ گر پڑے۔ یا کوئی سانپ اژدہا اس پر حملہ نہ کر دے۔ مچھر اُسے بے حد تنگ کر رہے تھے۔ برما کے جنگلوں کے مچھر بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ عبدل نے اُن سے بچنے کے لیے اپنا کوٹ اتار کر اپنے اُوپر کر لیا تھا اور ٹہنیوں کے دوشاخے پر اکڑوں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ وہ کہاں تھا اور کہاں آگیا۔ اُسے شہر میں گزارے ہوئے پُرسکون اور آرام وہ دن یاد آ رہے تھے۔ پھر اُسے خیال آیا کہ وہ اس مصیبت میں اکیلا نہیں تھا۔ لاکھوں لوگ اُس کے ساتھ گھر بار چھوڑ کر جنگلوں میں نکل گئے ہیں۔ اور پھر کئی مر گئے ہیں۔ بموں اور گولیوں نے اُن کو ہلاک کر دیا ہے کم از کم وہ زندہ تو ہے۔ اس خیال نے اُسے بڑی طاقت دی اور وہ ہر آفت کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

انہی خیالوں میں اونگھتے اونگھتے اُسے نیند آ گئی۔ خدا جانے رات کتنی گزر چکی تھی کہ پیاس کی وجہ سے اُس کا حلق سوکھنے لگا

اور اُس کی آنکھ کھل گئی۔ سب سے پہلی چیز جس کا عبدل کو احساس ہوا وہ جنگل کی خاموشی تھی۔ وہ اس سے پہلے بھی جنگل میں کئی راتیں گزار چکا تھا۔ لیکن آج کی رات بڑی گہری خاموش اور ڈراؤنی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ اکیلا تھا۔ اس سے پیشتر وہ سوانا، رحمت بابا اور دوسرے قافلے والوں کے ساتھ راتیں بسر کرتا رہا تھا۔ پھر بھی جنگل پر اس قدر گہرا سناٹا پہلے کبھی طاری نہیں ہوا تھا۔ اچانک اُسے یوں لگا جیسے کوئی شے اُس کے قریب ہی پتوں میں حرکت کر رہی ہے۔ وہ ہوشیار ہو گیا۔ پتوں کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز آ رہی تھی۔ پھر اُسے دو تین بار لمبی اور تیز سِسکار کی آواز سنائی دی۔

عبدل کا رنگ اُڑ گیا۔

اُس نے جونہی پلٹ کر دیکھا۔ اُس کا حلق خشک ہو گیا۔ ایک بہت بڑا اور موٹا سانپ یعنی اژدہا اُس کے ساتھ والی ٹہنی سے کھسکتا ہوا نیچے اُتر رہا تھا۔ عبدل نے سانس روک لی اور سانپ کو نیچے اُترتا ہوا دیکھنے لگا۔ اب اندھیرے میں اُسے ہر شے صاف نظر آنے لگی تھی۔ سانپ بڑا لمبا تھا اور بڑی آہستگی کے ساتھ درخت کی ٹہنی پر سے جھولتا ہوئے نیچے اُتر رہا تھا۔ پھر اُسے دھپ سے سانپ کے زمین پر گرنے کی آواز سنائی دی۔ عبدل نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اژدہا درخت سے نیچے اُتر گیا تھا۔ اُس

نے سانپ کو جنگل میں ایک طرف رینگ کر جاتے دیکھا۔ جب سانپ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو عبدل کی جان میں جان آئی۔

اُس نے سن رکھا تھا کہ برما کے جنگلوں کے اژدہا سالم کے سالم بکرے کو ہڑپ کر جاتے ہیں۔ خدا نے اس کی دعا قبول کر لی تھی جو اژدہا کے ہاتھوں اس کی جان بچ گئی۔ اب اُسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ بھوک اور پیاس الگ تنگ کر رہی تھی۔ ایک خوف سا اس کے دل پہ بیٹھ گیا تھا کہ کہیں درخت پر کوئی اور اژدہا نہ ہو۔ اس نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر درخت پر چاروں طرف دیکھا۔ اب اُسے ہر ٹہنی ایک سانپ نظر آ رہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور دل ہی دل میں خدا سے دعا مانگنے لگا۔

جنگل میں رات کی خاموشی پہلے سے زیادہ گہری ہو گئی۔ درختوں پر جو کبھی کبھی کوئی پرندہ بول لیتا تھا اب وہ بھی خاموش تھا۔ اُلّو کے بولنے کی دہشت ناک آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ عبدل سوچنے لگا کہ آخر اس قدر گہری خاموشی چاروں طرف کیوں چھا گئی ہے؟ جلد ہی یہ معمہ بھی حل ہو گیا۔ دُور کسی مور کے پی ہُو پی ہُو کی آواز سنائی دی۔ تھوڑی دیر بعد کسی درخت پر کوئی بندر خُو خُو کرتا ہوا چھلانگ لگا کر دوسرے درخت پر اُچھل گیا۔ اب ایک بار پھر ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ اور پھر ایک دم سارا جنگل شیر کی ہیبت ناک دھاڑ سے

گونج اُٹھا۔

شیر کے گرجنے کی یہ آواز ذرا فاصلے پر سے آئی تھی۔ عبدل کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اُسے تسلی تھی کہ وہ درخت پر چڑھ کر بیٹھا ہوا ہے۔ لیکن کیا خبر شیر چھلانگ لگا کر اس تک پہنچ جائے؟ وہ درخت پر چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔ دوسری بار شیر کے دھاڑنے کی آواز بالکل قریب سے سنائی دی۔ اُسے یوں لگا جیسے شیر کہیں آس پاس ہی چکّر لگا رہا ہو۔ عبدل نے سوچا کہ درخت پر اور اُوپر چڑھ جانا چاہیئے۔ اتنا سوچ کر وہ اُٹھا اور اپنے سے اوپر والی ٹہنی کو پکڑ کر ایک ہی ہلے سے اُوپر اُٹھ گیا۔ اب وہ زمین سے بیس پچیس فٹ کے فاصلے پر تھا اور محفوظ تھا۔

پھر بھی آس پاس شیر کی موجودگی کے احساس سے وہ پریشان ضرور تھا۔ تیسری بار شیر کی آواز کوئی دس بارہ فٹ کے فاصلے پر سے سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی ایک ہرن چوکڑیاں بھرتا ہوا اُس کے درخت کے نیچے سے گذرا۔ جیسے بجلی سی کوندی اور پلک جھپکنے میں ایک لمبے تڑنگے شیر نے چھلانگ لگا کر ہرن کو وہیں دبوچ لیا۔ شیر کے طاقتور پنجے کے ایک ہی وار نے ہرن کو چاروں شانے چت گرا دیا۔ وہ شیر کے نیچے تھوڑی دیر کو تڑپا اور پھر بے ہوش ہو گیا۔ یہ سارا تماشا عبدل کی آنکھوں کے سامنے

عین اُس درخت کے نیچے ہوا جس کی شاخ پر وہ بیٹھا تھا۔

شیر نے گردن اُٹھا کر ایک فاتحانہ نگاہ جنگل پر ڈالی اور پھر ہرن کو گردن سے گھسیٹتا ہوا ایک طرف لے جانے لگا۔ عین اُس وقت عبدل کا ایک ہاتھ ٹہنی پر سے کھسک گیا جس کی وجہ سے ٹہنیوں میں شور پیدا ہوا۔ شیر وہیں اور وہیں رُک گیا۔ اُس نے اپنے منہ میں دبوچے ہوئے ہرن کو زمین پر رکھا اور خوفناک زرد آنکھوں والا سر اُٹھا کر درخت کی طرف دیکھنے لگا۔ عبدل کانپ اُٹھا۔ شیر کی چمکیلی آنکھوں نے اندھیرے میں عبدل کو درخت پر بیٹھے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ بڑی شاہانہ چال چلتا آہستہ آہستہ درخت کی طرف بڑھا۔ تنے کے پاس آکر وہ رُک گیا۔ اُس نے اپنا چہرہ اُوپر اٹھایا اور بڑے غور سے ایک انسان کو شاخوں میں بیٹھے دیکھا۔ شیر کی آنکھوں میں عبدل کو شعلے چمکتے نظر آرہے تھے۔

اچانک شیر زور سے دھاڑا اور اُس نے اُچھل کر درخت کی ٹہنی کو پکڑنے کی کوشش کی۔ اگر عبدل نچلی ٹہنی پر بیٹھا ہوتا تو وہ ضرور شیر کا نوالہ بن جاتا۔ شیر نے پنجہ مار کر بڑی آسانی سے اُسے نیچے گرا لینا تھا۔ یہ اُس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اُوپر والی ٹہنی پر چڑھ گیا تھا۔ شیر ٹہنی سے ٹکرا کر نیچے گرا۔ وہ بار بار اچھل کر عبدل کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا اور بار بار نیچے گر رہا تھا۔ اُس نے گرج گرج کر سارے جنگل کو سر پر اُٹھا لیا تھا۔ درختوں پر

سے بے شمار پرندے شور مچاتے اُڑ گئے تھے۔ شیر جوں جوں ناکام ہو رہا تھا اُس کا غصہ غضب کی صورت اختیار کرتا چلا جا رہا تھا۔ وہ ہر قیمت پر عبدل کو مار گرانا چاہتا تھا۔ مگر عبدل چونکہ کافی اُونچے ٹہن پر بیٹھا تھا اس لیے شیر کی ایک بھی پیش نہ جا رہی تھی۔ عبدل سہما ہوا ٹہنی پر بیٹھا تھا اور اُس کے پسینے چھوٹ گئے تھے۔ وہ کانپتے ہوئے ہونٹوں سے دعائیں مانگ رہا تھا کہ خدا اُسے شیر کا تر نوالہ بننے سے بچائے۔

یہ شیر آدم خور نہیں تھا اور جو شیر آدم خور نہ ہو وہ کبھی انسان پر حملہ نہیں کرتا۔ تاوقتیکہ اُسے یہ احساس نہ ہو جائے کہ انسان اُسے ہلاک کرنا چاہتا ہے۔ لیکن یہ شیر اپنے شکار کو مار کر عبدل کی موجودگی سے چڑ گیا تھا۔ یا شاید اُسے یہ محسوس ہو گیا تھا کہ عبدل کوئی شکاری ہے جو اُسے ہلاک کر کے ہرن چھین لے جانا چاہتا ہے۔ جو کچھ بھی تھا بہرحال عبدل ایک مصیبت میں مبتلا ہو گیا تھا اور شیر بار بار درخت پر حملہ کر رہا تھا اور دھاڑیں مار مار کر گرج رہا تھا۔ کافی دیر ٹکریں مارنے کے بعد جب شیر کو یقین ہو گیا کہ وہ درخت کی اتنی بلندی تک نہیں پہنچ سکتا تو وہ بڑے غصے کے عالم میں درخت کے نیچے کھڑے ہو کر عبدل کو شعلہ بار آنکھوں سے تکنے اور بار بار دُم ہلانے لگا۔

پھر خدا جانے شیر کے جی میں کیا آئی کہ اُس نے سر جھکایا۔

اپنے لمبے لمبے دانتوں والے جبڑے میں ہرن کو دبوچا اور اُسے
گھسیٹتا ہوا جنگل میں گم ہو گیا۔

اُس کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی عبدل کی جان میں جان
آئی۔ اُس نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ سر سے بَلا ٹل گئی۔
وہ کتنی دیر تک ٹہن پر اُسی طرح دم سادھے بیٹھا رہا۔ اُسے
اپنی بھوک پیاس تک بھول گئی تھی۔ باقی ساری رات عبدل نے
درخت پر بیٹھے بیٹھے گزار دی۔ اب جنگل میں دن کا اُجالا
پھیلنا شروع ہو گیا۔ اندھیرے میں سے ہر شے دکھائی دینے
لگی۔ پرندوں نے درختوں پر چہچہانا شروع کر دیا۔ لیکن عبدل
کی ہمت نہ پڑی کہ درخت سے نیچے اُترے۔ اُسے یوں لگ
رہا تھا جیسے شیر رات کی ناکامی کا بدلہ لینے کے لیے کہیں قریب
ہی چھپا ہوا ہے۔ جب کافی دن چڑھ گیا اور جنگل میں روشنی پھیل
گئی تو عبدل نے سوچا کہ وہ کب تک بھوکا پیاسا یہاں بیٹھا
رہے گا۔ اُسے خدا پر بھی بھروسہ کرنا چاہیے۔ اگر اُس کی زندگی
لکھی ہوئی ہے تو اُسے دنیا کا کوئی بھی شیر ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ یہ
سوچ کر اُس نے خدا کا نام لیا اور آہستہ آہستہ درخت سے
نیچے اُترنا شروع کر دیا۔

پھر بھی وہ ہر قدم پر جھک کر نیچے دیکھ لیتا تھا کہ کہیں
شیر اُسے دبوچنے کے لیے نیچے تو نہیں کھڑا۔ مگر یہ عبدل کا

وہم تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ شیر اپنے شکار کو لے کر وہاں سے
کئی میل دُور بھومالی ندی کو عبور کر کے ایک پہاڑی غار میں پناہ
لے چکا تھا۔ ویسے بھی دن کی روشنی میں شیر اپنی کچھاروں
سے بہت ہی کم نکلتے ہیں۔ وہ راتوں کو اپنا شکار کھیلتے ہیں
اور اُسے ہڑپ کر دو دو دنوں تک غاروں میں سوئے رہتے
ہیں۔ بہت ہوا تو کسی وقت پانی پینے کے لیے اُٹھے اور
واپس آ کر پھر لیٹ گئے۔

عبدل نے درخت پر سے اُتر کر ڈرتے ڈرتے چاروں
طرف نگاہ دوڑائی جب اُسے دُور دُور تک شیر کا نام و نشان
تک دکھائی نہ دیا تو وہ جنگل میں ایک طرف بھاگنے لگا۔ جھاڑیوں
شاخوں، ٹہنیوں اور بڑے بڑے پتوں سے اُلجھتا وہ بھاگا
جا رہا تھا۔ وہ اُس مقام سے بہت دُور نکل جانا چاہتا تھا۔
گھنا جنگل قدم قدم پر اُس کا راستہ رُوک رہا تھا مگر عبدل
راستے کی تمام مشکلات اور دشواریوں کا مقابلہ کرتا ہوا آگے
ہی آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ کافی دُور نکل جانے کے بعد وہ
دم بھر کو ستانے کے لیے ایک جگہ رُک گیا۔ اتفاق سے
یہاں ٹھنڈے پانی کا ایک چھوٹا سا چشمہ بہہ رہا تھا۔ عبدل نے
جی بھر کر پیاس بجھائی اور تازہ دم ہو کر سوچنے لگا کہ اب
کدھر کا رُخ کیا جائے؟ جنگل میں چلتے چلتے وہ راستے کا

رُخ بھول گیا تھا۔ مگر آگے چلتے رہنے کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ قریب ہی ایک درخت پر اُسے کچھ جنگلی پھل مل گئے جنہیں کھا کر اُس نے اپنی تھوڑی بہت بھوک مٹائی۔ اُس کے جوتے پھٹ گئے تھے اور پاؤں میں کئی جگہ کانٹے چُبھنے سے خون رِس رہا تھا۔ اُس نے چشمے کے پانی سے منہ ہاتھ اور پاؤں دھوئے۔

وہ چلنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ایکا ایکی اُسے یوں محسوس ہوا جیسے جنگل میں پتوں پر کوئی چل رہا ہے۔ وہ سہم گیا۔ یقیناً شیر اُس کا پیچھا کرتا ہوا اُس تک پہنچ گیا تھا۔ ابھی وہ پوری طرح سنبھل بھی نہ سکا تھا کہ ایک جاپانی گوریلا سنگین تانے چھلانگ لگا کر اُس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"ہینڈز اَپ"

عبدل نے دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھا لیے۔ اب اِدھر اُدھر سے تین چار اور گوریلے سنگین تانے نکل آئے اور عبدل کے اِرد گرد جمع ہو گئے۔ اُن میں سے ایک جاپانی ٹوٹی پھوٹی اُردو بول لیتا تھا۔ اُس نے عبدل کو ٹھوکر مار کر کہا۔

"تمہارے ساتھی کہاں ہیں؟"

عبدل پریشان ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ ایک مصیبت سے نکل کر وہ دوسری مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ پھر بھی اُس

نے اپنے ہوش ٹھکانے رکھے اور گھبرانے کی بجائے حالات کا ہمت سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اُس نے پوچھا۔

"کون سے ساتھی؟"

جاپانی نے اُس کے بازو پر سنگین چبھو کر کہا۔

"تمہارے گوریلا ساتھی"

عبدل کے بازو میں درد کی ٹیس اُٹھی مگر وہ برداشت کر گیا۔ اُس نے جاپانی کو سمجھانے کی کوشش کی اور کہا کہ وہ اپنے دوسرے بے گناہ شہریوں کے ساتھ قافلے کی شکل میں رنگون سے نکلا تھا۔ راستے میں پُل پر بمباری کی وجہ سے وہ اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا اور اب اکیلا سفر کر رہا ہے۔ اس بات پر جاپانی بڑی مکاری سے مسکرایا اور بولا۔

"ہم کو بے وقوف بناتا ہے۔ ہم نے تمہارے لوگوں کی ایسی بہت سی کہانیاں سُنی ہیں۔ تم جھوٹ بولتے ہو۔ تم ہندوستانی گوریلا لڑاکا ہو۔ بولو تمہارے دوسرے ساتھی کہاں ہیں؟"

عبدل نے کہا:

"میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں گوریلا نہیں ہوں اور میرا کوئی ساتھی نہیں ہے"

اس پر جاپانی نے زور سے بندوق کا دستہ عبدل کے بازو

پر مارا۔ درد سے عبدل کی چیخ نکل گئی اور وہ گر پڑا۔ قریب تھا کہ وہ جاپانی عبدل کے سینے میں سنگین گھونپ دیتا کہ دوسرے جاپانی گوریلے نے اُسے روک کر جاپانی زبان میں کچھ کہا۔ وہ رُک گیا۔ اُس نے قہر آلود نظروں سے عبدل کو دیکھا۔

"ٹھیک ہے۔ کیمپ میں جا کر تم سچ بول دے گا۔ چلو"

اور وہ جاپانی گوریلے عبدل کو بکرے کی طرح ہانکتے ہوئے جنگل میں ایک طرف روانہ ہو گئے۔

تھوڑی ہی دُور چلنے کے بعد وہ ایک ٹیلے سے نیچے اُتر گئے۔ اب ایک گہری گھاٹی شروع ہو گئی تھی۔ گھاٹی جہاں ختم ہوتی تھی وہاں جنگلی جھاڑیوں اور بڑے بڑے سبز پتوں والی بیلوں میں چھپا ہوا ایک غار تھا۔ غار کے دروازے پر ایک جاپانی گوریلا پہرہ دے رہا تھا۔ جاپانی سپاہیوں کو اپنی طرف آتے دیکھ کر پہریدار گوریلے نے سلیوٹ کیا اور پتوں کی چھپریل غار کے منہ سے پرے ہٹا دی۔ عبدل جاپانی گوریلوں کے ساتھ غار میں داخل ہو گیا۔ غار میں اندھیرا تھا۔ چھت سے پانی ٹپک رہا تھا۔ غار ایک طرف موڑ گھوم گیا۔ یہاں تیل کا ایک لیمپ جل رہا تھا۔ موڑ گھومنے کے بعد عبدل ایک کمرے میں آگیا جس کی چھت اُونچی تھی اور فرش پر ایک بڑی سی میز کے گرد چھ سات جاپانی گوریلا افسر کھڑے آپس میں صلاح مشورے کر رہے تھے۔

انہوں نے عبدل کو غور سے دیکھا اور پھر آپس میں جاپانی زبان میں باتیں کرنے لگے۔ عبدل کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بس اُسے تو اتنا ہی معلوم تھا کہ وہ جاپانی فوج کی قید میں آگیا ہے اور اب اُسے یہاں سے کوئی معجزہ ہی باہر نکال سکتا ہے۔

جاپانی افسر نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ جس پر دو جاپانی گوریلے عبدل کو لے کر غار کے عقبی حصّے کی طرف آگئے۔ یہاں اُسے ایک تنگ و تاریک کمرے میں ڈال کر سلاخ دار جنگلے پر تالہ ڈال دیا گیا۔

باب ۶

قید سے فرار

پیارے بچو!

جو لوگ دوسری جنگِ عظیم میں جاپانیوں کی قید میں رہ چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ جاپانی اپنے جنگی قیدیوں پر کس قدر ظلم و ستم کیا کرتے تھے۔ وہ اُن سے سڑکیں کٹواتے، پتھر تڑواتے، انہیں طرح طرح کی اذیتیں دیتے اور پھر کھانے کو دن میں صرف ایک کٹورا سادے نمکین چاولوں کا دیتے۔ جنگ ختم ہونے پر جب اتحادی فوجوں نے باقی ماندہ انگریز اور ہندوستانی جنگی قیدیوں کو جاپان کی قید سے آزاد کرایا تو وہ پہچانے نہ جاتے تھے۔ وہ سُوکھ کر کانٹا بن گئے تھے۔ کئی تو قیدی کیمپوں میں ہی مر گئے تھے حالانکہ جاپانی ایک بہادر قوم ہے۔ مگر انھیں انگریزوں سے بیر تھا۔ وہ انگریز اور امریکی قیدیوں پر بے حد ظلم کرتے لیکن ہندوستانی قیدیوں پر اس لیے کم ظلم کرتے کہ وہ کرائے کے سپاہی تھے اور چند روپوں کی خاطر انگریزوں کی طرف سے لڑ رہے تھے۔

پھر بھی انھیں جس قیدی پر شبہ ہو جاتا کہ وہ دشمن کی فوجوں کے بارے میں کوئی معلومات بہم پہنچا سکتا ہے تو

اُسے درختوں کے ساتھ اُلٹا لٹکا کر سنگینوں سے اُسے کچوکے لگاتے۔ اُس کے نیچے آگ جلا دیتے اور اُسے جلتے کوئلوں پر لٹا کر اُوپر سے باری باری گزرتے۔ جاپانی خود کبھی قید نہیں ہوتے تھے۔ شاید اس لئے بھی کہ انھیں یقین تھا کہ اگر وہ امریکی یا انگریزوں کی قید میں چلے گئے تو انہیں زندہ نہیں چھوڑا جائیگا۔ اگر کوئی جاپانی سپاہی گھِر بھی جاتا تو وہ ہتھیار ڈالنے اور قید ہونے کی بجائے پستول سے خودکشی کر لیتا۔ یا اپنے پیٹ میں تلوار گھونپ کر ہاراکیری کر لیتا۔ ہاراکیری جاپانی زبان میں پیٹ میں تلوار گھونپ کر خودکُشی کرنے کو کہتے ہیں۔

بہرحال جاپانی فوجی بڑے سنگدل تھے۔

اُن پر دشمن کی چیخ و پکار اور اذیت میں بلبلاتے قیدیوں کی آہ و زاری کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ وہ اُن کی طرف دیکھ کر قہقہے لگایا کرتے تھے۔ دوسری طرف وہ بہادر بھی بہت تھے۔ اکیلا جاپانی فوجی چھ چھ سات سات سپاہیوں کا سنگین سے مقابلہ کرتا۔ وہ اپنے مورچے میں ہلاک ہو جاتا لیکن ہتھیار نہ ڈالتا۔ جنگوں کی تاریخ میں پہلی بار جاپانیوں نے یہ بہادری بھی کر دکھائی کہ اُن کے ہوا باز جہاز میں بم بھر کر جہاز سمیت دشمن کے بحری جہاز پر گر پڑتے۔ خود بھی ہلاک ہو جاتے اور جہاز کے بھی پرخچے اُڑا دیتے۔ "انسانی تارپیڈو" بھی جاپانیوں نے ہی ایجاد کئے تھے۔ ہوتا

یہ تھا کہ جب کوئی تارپیڈو جاپانی آب دوز کشتی میں سے دشمن کے بحری جہاز پر چھوڑا جاتا تو عام طور پر وہ نشانے پر ٹھیک نہیں بیٹھتا تھا۔ سمندر کی لہریں اُسے نشانے سے ہٹا دیتی تھیں۔ جاپانیوں نے اس کا حل یہ تلاش کیا کہ ایک سپاہی تارپیڈو کے اُوپر غوطہ خوری کا لباس پہن کر بیٹھ جاتا۔ اُس کے ہاتھ میں ہینڈل ہوتا جو تارپیڈو کی سمت کو کنٹرول کر رہا ہوتا۔ وہ سپاہی سمندر کے اندر ہی اندر تارپیڈو پر سوار ہو کر ہینڈل سے اُسے کنٹرول کرتے ہوئے دشمن کے جہاز سے جا ٹکراتا اور جہاز کے ساتھ خود بھی تباہ ہو جاتا۔ جنگوں کی تاریخ کے ماہر کہتے ہیں کہ اگر جاپانیوں پر ایٹم بم نہ گرایا جاتا تو یہ قوم سارے مشرق بعید پر قبضہ کر لیتی۔

عبدل اِن ہی سنگ دل جاپانیوں کی قید میں تھا۔

وہ سارا دن غار کی ٹھنڈی کوٹھڑی میں ٹھٹھرتا رہا۔ یہاں سردی اور نمی تھی۔ ایک جاپانی تالہ کھول کر اندر آیا۔ اُس نے عبدل کو ایک گندا سا کمبل اور کھانے کو نمکین چاولوں کا ایک کٹورہ دیا اور تالہ لگا کر واپس چلا گیا۔ عبدل نے کچھ پھیکے کچھ نمکین موٹے موٹے چاول کھا کر اللہ کا شکر ادا کیا اور کمبل اوڑھ کر کوٹھڑی کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کا دماغ بڑی تیزی سے وہاں سے فرار ہونے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ لیکن اس غار

سے نکل بھاگنا اُسے بہت مشکل دکھائی دے رہا تھا۔ وہ انہی خیالوں میں الجھا ہوا تھا کہ ایک جاپانی سپاہی تالہ کھول کر اندر آیا اور اُسے اپنے ساتھ ایک تہہ خانے میں لے گیا۔ یہاں قیدیوں کو اذیتیں دے کر اُن سے پوچھ گچھ کی جاتی تھی۔ جاپانیوں نے اُسے بانس کے کانٹوں پر لِٹا دیا اور اُس کی گردن پر سنگین کی نوک رکھ دی۔

"بولو۔ تمہارا ساتھی گوریلا کدھر ہے؟"

عبدل کا کوئی گوریلا ساتھی ہوتا تو وہ جواب دیتا۔ وہ تو بیچارہ بے گناہ، مصیبت زدہ مہاجر تھا۔ اُس نے پھر وہی جواب دیا کہ میں گوریلا نہیں ہوں بلکہ رنگون کا ایک عام شہری ہوں اور جنگ کی تباہ کاریوں کے بعد جنگل میں پیدل سفر کر کے کاکسز بازار کو جا رہا ہوں۔ اس پر جاپانی قہقہے لگا کر ہنسنے لگے۔ پھر انہوں نے اُسے اور زیادہ اذیت دی۔ اُس کے گھٹنوں پر لوہے کی ہتھوڑیوں سے چوٹیں لگائیں۔ اُس کے ناخنوں کو توڑنے مروڑنے کی کوشش کی۔ عبدل بے چارہ تکلیف سے چلاتا اور خدا کو یاد کرتا رہا۔

جب جاپانی تھک گئے تو عبدل کو زخمی اور نیم بے ہوشی کی حالت میں اُس کی کوٹھڑی میں پھینک کر چلے گئے۔

عبدل ساری رات درد سے کراہتا رہا۔ اگلے دن اُسے پانی کا ایک گلاس اور چاولوں کا ایک کٹورہ دیا گیا جو اُس نے زہر مار کر کے کھایا۔ اُس کے ناخنوں سے خون رِس رِس کر جم گیا تھا اور

سارے بدن پر بانس کے کانٹوں کے زخم تھے۔ دو دن اسی طرح
گزر گئے۔ تیسرے روز عبدل اپنے ہاتھوں کو بغل میں دبائے گندہ
کمبل اوڑھے کوٹھڑی میں بیٹھا خدا سے گڑگڑا کر اپنی رہائی کی
دعائیں مانگ رہا تھا کہ ایک جاپانی گوریلا اندر داخل ہوا اور
اُسے ٹھوکر مار کر بولا۔

"چلو۔ میرے ساتھ چلو۔"

عبدل چپ چاپ اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

غار کی مختلف راہداریوں سے ہوتے ہوئے وہ دونوں ایک
چھوٹے سے کمرے میں آ گئے جہاں پہاڑ کے ایک سوراخ میں
سے روشنی آ رہی تھی۔ ایک پھولے پھولے گالوں والا کُپّا سا جاپانی
فوجی افسر میز پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ عبدل کو کمرے میں داخل
ہوتے دیکھ کر اُس نے جاپانی گوریلے کو ہاتھ کا اشارہ کیا۔ گوریلا
سلیوٹ مار کر واپس چلا گیا۔ اب کمرے میں جاپانی افسر اور عبدل
اکیلے تھے۔ جاپانی افسر مسکراتا ہوا اپنی کرسی سے اُٹھا اور آہستہ
سے چلتا ہوا عبدل کے پاس آ کر رُک گیا۔ پھر بڑی مکاری سے
محبت بھرے انداز میں اُس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولا۔

"دیکھو! تم ابھی لڑکا لوگ ہے۔ تمہارا مافق ہمارا بھی ایک
لڑکا جاپان میں ہے۔ ہم تم سے پیار کرتا۔ تم ہم کو بول دو کہ
تمہارا دوسرا گوریلا ساتھی کدھر کو چھپا ہوا ہے۔ ہم تم کو چھوڑ

دے گا۔ نئے کپڑے دے گا۔ کھانے کو مچھلی چاول دے گا۔
ہم تم کو کاکسز بازار بھی پہنچا دے گا۔ بولو!"

عبدل نے بڑی ہی عاجزی کے ساتھ کہا۔

"کرنل صاحب! میں مسلمان ہوں اور مسلمان جھوٹ نہیں
بولا کرتا۔ میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں گوریلا نہیں
ہوں۔ میرا کوئی گوریلا ساتھی نہیں ہے۔ اور میرا کسی گوریلا فوج
سے تعلق نہیں ہے۔"

جاپانی افسر پر عبدل کی ان سچی باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ
برابر اُسی انداز میں مکارانہ ہنسی ہنستا رہا۔ اور عبدل کے گال
تھپتھپا کر بولا۔

"تم ہمیں اچھا لڑکا لگا۔ تم ہمیں ٹھیک اپنے بچے کی مافق
لگا۔ ہم تمہیں تمہارے شہر بھیج دے گا۔ تم کو نئے کپڑے بھی
دے گا۔ تم ہم کو اتنا بول دے گا کہ تمہارا گوریلا ساتھی کہاں
چھپا ہوا ہے؟"

عبدل بے چارے کی جان عجیب مصیبت میں پھنس گئی تھی۔
اُس نے ایک بار پھر گڑگڑا کر کہا کہ اُسے کچھ خبر نہیں اور یہ
کہ اُس کا گوریلا فوجیوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اتنا کہنا تھا
کہ ایک زناٹے دار تھپڑ اُس کی گال پر پڑا اور وہ گر پڑا۔ ابھی
وہ اُٹھا بھی نہیں تھا کہ جاپانی افسر اُسے بوٹ سے ٹھوکریں مارنے

لگا۔ درد کی شدت سے اُس کی چیخ نکل گئی۔ وہی جاپانی جو ایک لمحہ پہلے اُسے اپنے لڑکے کے برابر سمجھ رہا تھا اب اُسے جنگلی وحشی کی طرح پیٹ رہا تھا۔ جب وہ عبدل کو مار مار کر تھک گیا تو اُس نے پانی کا ایک گلاس پیا اور زور سے کسی کو آواز دی۔

ایک جاپانی فوجی اندر آیا۔ افسر نے اپنی زبان میں اُسے کچھ کہا اور وہ جاپانی فوجی عبدل کو لے کر واپس اُس کی کوٹھڑی میں آلوؤں کی بوری کی مانند پھینک گیا۔ ساری رات عبدل کے جسم سے ٹیسیں اُٹھتی رہیں۔ وہ درد سے تڑپتا رہا۔ اگلے روز درد کم ہوا تو اُس کا ذہن بھی کام کرنے لگا وہ سوچنے لگا کہ ان ظالموں کی قید سے کیونکر رہائی حاصل کی جائے۔ اُسے ان جاپانی گوریلوں سے نفرت ہو گئی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اُس کے پاس بم ہو تو وہ سارے غار کو بم سے اُڑا دے۔ بے شک وہ خود بھی ساتھ ہی ختم ہو جائے۔

عبدل کو جاپانی گوریلوں کی قید میں ساتواں روز جا رہا تھا۔ اس دوران میں اُس نے ایک بار بھی سورج کی جھلک نہیں دیکھی تھی۔ وہ سارا دن اور ساری رات غار کی نم آلود ٹھنڈی اور نیم تاریک تنگ کوٹھڑی میں ٹھنڈے فرش پر پڑا رہتا۔ دن میں ایک دو بار اُسے پانی اور اُبلے ہوئے تھوڑے سے نمکین چاول دے دیئے جاتے۔ اُس کے ناخنوں کے زخم اپنے آپ ہی ٹھیک

ہو گئے تھے۔ بدن کی ٹیسیں بھی کم ہو گئی تھیں۔ دن بھر وہ خدا کو یاد کرتا اور دُعائیں مانگتا رہتا۔ بظاہر اس خوفناک غار سے نکل بھاگنا ناممکن نظر آتا تھا لیکن عبدل کو اللہ پہ بھروسہ تھا اور اُسے یقین تھا کہ وہ بہت جلد جاپانی ظالموں کی قید سے آزاد ہو جائے گا۔

قید کا آٹھواں یا نواں روز تھا کہ کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور جاپانی ایک نوجوان لمبے تڑنگے قیدی کو اندر پھینک کر چلے گئے۔ اس قیدی کا رنگ سانولا تھا۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں تھیں اور اُس نے گوریلوں ایسی وردی پہنی ہوئی تھی۔ وہ عبدل کو دیکھ کر حیرانی سے بولا۔

"تم کون ہے؟ اُردو بولتا ہے؟"

عبدل نے بڑی صاف اُردو میں نووارد قیدی کو بتایا کہ اُس کا نام عبدل ہے۔ وہ گجرات کا رہنے والا ہے۔ رنگون میں پیدا ہوا اور بمباری کے بعد رنگون چھوڑ کر بھاگ رہا تھا کہ جاپانیوں کی قید میں پھنس گیا اس پر نووارد قیدی نے مسکرا کر عبدل کے شانے کو تھپتھپایا اور بولا۔

"بچو جی! تم تو اپنے گرائیں ہو۔ میں بھی ضلع گجرات کا رہنے والا ہوں۔"

اُس کا نام ساندل خان تھا اور وہ مشرق بعید میں جاپانیوں

کے خلاف لڑنے والی آٹھویں پنجاب رجمنٹ کا کمانڈر تھا۔ وہ
اکیاب اور پروم کے جنگلوں میں پسپا ہوتی ہندوستانی انگریزی
فوج کے آخری دستے سے منسلک تھا اور پسپا ہوتے ہوئے
ایک پُل کو اڑانے کی کوشش کر رہا تھا کہ جاپانیوں نے اُسے
گرفتار کر لیا۔ ساندل خان بڑا دلیر، نڈر اور بہادر فوجی تھا۔
اُس نے عبدل کو حوصلہ دیا کہ فکر نہ کرو خدا نے چاہا تو ہم
دونوں جاپانیوں کی قید سے فرار ہو جائیں گے۔ عبدل کو یقین
نہ آتا تھا۔ اُس نے کہا۔

"اس غار سے ہم کیسے نکل سکیں گے؟ قدم قدم پر پہرہ
بیٹھا ہے۔"

ساندل خان مسکرایا۔

"جہاں قدم قدم پر پہرہ ہو وہیں سے فرار بھی ہوا جاتا ہے
تم اللہ کی شان دیکھتے رہو۔ ہمیں ٹریننگ ہی یہی ملی ہے کہ
کسی حالت میں بھی ہمت نہیں ہارنی۔"

عبدل کو کچھ حوصلہ ہوا۔ ہمت بندھی۔ وگرنہ وہ تو بالکل
ہی نا اُمید ہو چلا تھا۔ لیکن اُس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی
تھی کہ ساندل خان اُس تہہ خانے سے اُسے کیونکر باہر نکالے
گا؟ مگر جلد ہی عبدل کو پتہ چل گیا کہ ساندل خان واقعی کمال کا
دلیر فوجی ہے اور وہ جو کچھ کہہ رہا ہے بالکل سچ ہے۔ جاپانی

سپاہی چاولوں کی رکابی اندر رکھ کر چلا گیا۔

وہ دروازے کو تالا لگا کر نگاہوں سے اوجھل ہوا تو
ساندل خان نے اپنے جوتے کے اندر سے پتلی سی شیشے کی
ایک نلکی نکالی جس میں زرد رنگ کا پانی سا بھرا تھا۔

"بھلا بوجھو یہ کیا ہے؟"

عبدل نے غور سے نلکی کو دیکھا اور بولا۔

"کوئی دوائی ہے شاید۔"

ساندل خان ہنسا اور کہنے لگا۔

"بچو جی! اس میں گندھک کا تیزاب ہے۔ ایک اور
تیزاب بھی ہے۔"

"یہ کس کام آئے گا؟"

"یہ ہمیں یہاں سے آزاد کرائے گا۔"

"یہ تیزاب؟"

"ہاں۔ یہی تیزاب۔ تم دیکھتے جاؤ۔ ذرا رات پڑ جانے
دو۔ پھر تمہیں اس تیزاب کے کارنامے دکھاؤں گا۔"

عبدل حیرانی سے نلکی میں بھرے ہوئے تیزاب کو دیکھنے لگا۔
رات ہو گئی۔ چوکی پہرہ بدلا۔ پہریدار کوٹھڑی کے جنگلے
میں سے اندر جھانک کر دونوں قیدیوں کو دیکھا اور تسلی کر کے
چلا گیا۔ ساندل خان جھوٹ موٹ سو رہا تھا۔ کوٹھڑی میں

اندھیرا تھا۔ صرف باہر غار میں جلتے ہوئے لیمپ کی ہلکی ہلکی
روشنی اندر آ رہی تھی۔ جاپانی سپاہی کے جاتے ہی ساندل آہستہ
سے اٹھا۔ اس نے جنگلے کے پاس جا کر اِدھر اُدھر جھانک کر دیکھا۔
جب اُسے اطمینان ہو گیا کہ آس پاس کوئی جاپانی سپاہی نہیں ہے
تو اُس نے جوتے میں سے نلکی نکالی۔ اُسے کھولا اور قطرہ قطرہ
کر کے جنگلے کی آہنی سلاخوں پر گرانے لگا۔ یہ تیزاب اُس جگہ
ڈالا جا رہا تھا جہاں سلاخیں اُوپر کو اُٹھتی تھیں۔ کتنی دیر ساندل
خان اسی کام میں مصروف رہا۔ غار میں پہریدار کے قدموں کی
چاپ سُنائی دی تو وہ ایک دم کوٹھڑی میں آ کر لیٹ گیا۔

"عبدل! تم بھی آنکھیں بند کر لو۔"

عبدل نے بھی آنکھیں بند کر لیں۔ پہریدار آیا۔ اُس نے
جھانک کر اندر دیکھا اور قیدیوں کو سوتا ہوا دیکھ کر واپس چلا
گیا۔ اُس کے جاتے ہی ساندل خان پھر اپنے کام میں لگ گیا۔
دو راتیں وہ مسلسل چار سلاخوں کی بنیادوں پر تیزاب گراتا رہا۔
چوتھی رات کو نصف شب کے بعد جب اُس نے سلاخوں کو
ذرا سا دھکا دیا تو وہ اپنی جڑ سے اُکھڑ چکی تھیں۔ ساندل خان
کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اُس نے واپس آ کر عبدل
سے کہا۔

"چار سلاخیں جڑ سے اُکھڑ چکی ہیں۔ اب ہمیں مناسب

وقت کا انتظار کرنا ہے۔"

اور ایک روز بعد وہ مناسب وقت بھی آ گیا۔

اُس رات خدا جانے جاپانی کس فتح کی خوشی میں غار کے
باہر جنگل میں زبردست جشن منا رہے تھے۔ اُن کی دھما چوکڑیوں
اور شور شرابے کی آوازیں اندر غار تک آ رہی تھیں۔

"بچو جی! تیار ہو جاؤ۔ جوان بنو۔ جیسے میں کہوں ویسے
کرتے جانا۔ ہمارے فرار کا وقت آ گیا ہے۔"

ساندل خان نے جنگلے کے قریب جا کر لوہے کی چاروں
اُکھڑی ہوئی سلاخوں کو زور لگا کر ٹیڑھا کر دیا۔ اب وہاں اتنی
جگہ بن گئی تھی کہ ایک آدمی وہاں سے بہ آسانی گذر سکتا تھا۔
ساندل نے جنگلے میں سے گذرتے ہوئے آہستہ سے عبدل
کو کہا۔

"میرے پیچھے چلے آؤ۔ قدموں کی آواز پیدا نہ ہو۔"

عبدل کچھ کچھ ڈر بھی رہا تھا مگر ساندل کی وجہ سے اُسے
حوصلہ بھی تھا۔ کم از کم یہ خیال اُسے ضرور ہمت دلا رہا تھا
کہ وہ اکیلا نہیں ہے۔ وہ بڑی تیزی سے جنگلے میں سے
نکل کر باہر غار میں آ گیا۔ وہ دونوں غار کی دیوار کے ساتھ
چمٹے ایک پل کے لیے کھڑے رہے۔ جب ساندل کو یقین ہو
گیا کہ اِرد گرد کوئی جاپانی نہیں ہے تو وہ عبدل کو لے کر غار

کی نیم روشن راہداری میں سے گزرنے لگا۔ اچانک ایک موڑ
گھومتے ہوئے اُس نے ایک جاپانی پہرے دار کو دیکھا جو ایک
سٹول پر دیوار سے ٹیک لگائے سو رہا تھا اور اُس کی رائفل
اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گری پڑی تھی۔

ساندل نے کمال کر دیا۔ بلی کی طرح آگے بڑھا۔ رائفل اُٹھائی
اور پلک جھپکنے میں اُس کا وزنی دستہ اِس زور سے جاپانی کے
سر پہ مارا کہ بے چارہ اُف کئے بغیر گرا اور مر گیا۔

"جلدی آؤ"

ساندل عبدل کو ساتھ لے کر تیزی سے آگے بڑھا۔

اب نیم روشن راہداری ایک بڑے کمرے میں آ گئی تھی
جہاں جاپانی کرنل کا دفتر تھا۔ دفتر خالی پڑا تھا۔ میز پہ لیمپ
جل رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کرنل بھی جشن منانے غار کے باہر
گیا ہوا ہے۔ ساندل نے عبدل کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

اب وہ غار کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ یہ سیڑھیاں غار
کے دروازے پہ جا کر ختم ہو گئیں۔ یہ دروازہ گھاس پھونس کی
کھپریل کا تھا اور باہر جنگل میں کھلتا تھا۔ اب وہاں ایک منٹ
بھی ضائع کرنا اپنی موت کو دعوت دینا تھا۔

چنانچہ ساندل خان نے آگے بڑھ کر کھپریل کی جھریوں میں
سے باہر دیکھا۔ پھر اُس نے عبدل کو اشارہ کیا۔ کھپریل کو ذرا سا

ہٹایا اور باہر نکل گیا۔ عبدل بھی اُس کے ساتھ ہی غار سے
باہر نکل آیا۔ باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ غار کے دروازے پر پہرہ
دینے والا جاپانی سپاہی ذرا فاصلے پر شراب کی بوتل ہاتھ میں
لیے اُونگھ رہا تھا۔ قریب ہی جاپانی جنگلی سُور بھون رہے
تھے۔ الاؤ روشن تھا اور انہوں نے ایک ہنگامہ بپا کر رکھا تھا۔
غار کی طرف درختوں کا سایہ تھا۔ ساندل نے عبدل کو ساتھ لیا
اور بڑی تیزی سے ٹیلے کی دوسری جانب نکل گئے۔ ساندل خان
نے عبدل کو کہا۔

"اب بھاگو۔ رُکنا کہیں نہیں"

اور اس کے ساتھ ہی وہ جنگل میں ایک طرف کو اُٹھ
دوڑے۔

باب ۷

کاشان قبیلہ

ساندل خان اور عبدل جنگل میں دوڑتے چلے گئے۔ انہوں نے کئی چھوٹی چھوٹی ندیاں اور نالے عبور کیے۔ کئی چٹانوں کے موڑ کاٹے۔ آخر جب عبدل نے کہا کہ میں تھک گیا ہوں تو ساندل خان رُک گیا۔ اُس نے عبدل سے کہا۔

"اگر ہم یہاں رُک گئے تو جاپانی ہمارے سر پر آن پہنچیں گے۔ ہمت کرو۔ ہمیں جتنی جلدی ہو سکے رسّوں کے پُل تک پہنچنا ہے۔"

عبدل کا سانس پھولا ہوا تھا۔ اُس نے کہا۔

"میں ذرا دم لے لوں۔"

ساندل خان بادلِ نخواستہ رُک گیا۔ عبدل کا سانس ذرا درست ہوا تو انہوں نے پھر دوڑنا شروع کر دیا۔ ایک ٹیلے کا موڑ گھوم کر وہ پہاڑی کی ڈھلان سے نیچے اُترے تو سامنے ایک کافی بڑا پہاڑی نالہ بہہ رہا تھا۔ اس نالے کے اُوپر رسّوں کا ایک پُل بندھا تھا۔

"ہمیں بہت جلد اس پُل پر سے گذر جانا ہے۔"

اور وہ دونوں دوسرے ہی لمحے پُل پر پہنچ گئے۔ ساندل نے عبدل سے کہا کہ وہ رسّوں کو مضبوطی سے پکڑ کر چلے۔ پُل اُن کے بوجھ سے ہلنے لگا۔ عبدل نے نیچے دیکھا۔ پانی بڑی تیزی سے پتھروں سے ٹکراتا، جھاگ اُڑاتا بہہ رہا تھا۔ اُسے ڈر محسوس ہوا۔ پھر اُس نے ہمت سے کام لیا اور ساندل کے پیچھے پیچھے رسّوں کے پُل پر سے گذرنے لگا۔

چند لمحوں میں انہوں نے پُل عبور کر لیا۔

اب وہ پُل کی دوسری جانب چٹانوں کے درمیان کھڑے تھے۔ ساندل نے لپک کر دو نوکیلے پتھر اُٹھائے اور اُن سے پُل کے رسّے کو توڑنے لگا۔

"تم نیچے والے رسّے کو پتھروں سے کچل دو۔"

عبدل بھی دو پتھروں سے رسّے کو کچلنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے دونوں نیچے والی رسیاں کٹ گئیں۔ اب انہوں نے اُوپر والی رسیوں کو پتھروں سے کچلنا شروع کر دیا۔ ابھی انہوں نے پتھر چلانے شروع ہی کیے تھے کہ اُس پار جنگل میں گولیاں چلنے کی آوازیں گونج اٹھیں۔ ساندل نے کہا۔

"جاپانی ہماری تلاش میں آ گئے ہیں۔ اُن کے پُل تک پہنچنے سے پہلے ہی پُل کو گرا دینا ہوگا۔ تیزی دکھاؤ عبدل۔ نہیں تو ہماری خون میں تڑپتی لاشیں اِس جنگل میں پڑی گدھوں کا

نوالہ بن رہی ہوں گی۔"

انہوں نے جلدی جلدی پتھر چلانے شروع کر دیئے۔

جاپانی اب سامنے والے جنگل سے نکل کر پُل کے دوسرے کنارے پر آ گئے تھے اور اپنی زبان میں شور مچا مچا کر ایک دوسرے کو ادھر سے اُدھر بلا رہے تھے۔ اُنہوں نے شاید دُوربین کی مدد سے سانڈل اور عبدل کو پُل کی دوسری جانب دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے فائر کھول دیا۔ مشین گن کی گولیاں سانڈل خان اور عبدل کے سروں کے اُوپر سے گزرنے لگیں۔

"عبدل پتھروں پر لیٹ جاؤ۔ خبردار ہاتھ نہ رُکیں۔

ہمیں پل کو توڑ دینا ہے۔"

وہ پتھروں پر لیٹ کر پُل کے رسّوں کو توڑنے کی سرتوڑ کوشش میں لگے رہے اور جاپانی سپاہی مشین گن کے مسلسل فائر میں پُل کی طرف بڑھے۔ گولیاں چٹان کے پتھروں سے ٹکرا کر پھٹ رہی تھیں۔ جاپانی پُل پر سوار ہو چکے تھے اور اب پُل نے اُن کے بوجھ سے ڈولنا شروع کر دیا تھا۔

"جلدی کرو عبدل۔ جاپانی پُل پر آ گئے ہیں۔"

جاپانی آہستہ آہستہ رسّوں کا سہارا لیتے پُل پر آگے بڑھ رہے تھے اور اُن کے اُوپر سے ہو کر مشین گن کی گولیاں عبدل اور سانڈل خان کے اردگرد گر رہی تھیں۔ جاپانی جب پُل کے

درمیان میں پہنچے تو سانڈل خان والی رسّی ٹوٹ گئی۔ اب صرف ایک رسّہ باقی تھا جسے عبدل مسلسل توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سانڈل نے لپک کر یہ کام اپنے ذمے لے لیا اور پوری طاقت سے رسّی کو پتھروں میں لے کر کچلنے لگا۔ جاپانیوں نے انہیں رسّے توڑتے دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے پُل پر کھڑے ہو کر سانڈل خان پر گولی چلانے کی کوشش کی۔ لیکن پُل کے ڈولنے کی وجہ سے وہ گولی ٹھیک نشانے پر نہ چلا سکے۔ کچھ تو رسّوں کا پُل جاپانی سپاہیوں کے بوجھ کی وجہ سے ڈول رہا تھا اور باقی کی کسر سانڈل خان نے یوں پوری کر دی کہ پُل کے رسّوں کو زور سے ہلا دیا۔

اب پُل بازی گروں کے تنے ہوئے رسّے کی طرح اِدھر سے اُدھر جھول رہا تھا اور جاپانی سپاہی مشکل سے اپنا توازن برقرار رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ایک چالاک جاپانی سپاہی رینگتا ہوا بالکل سانڈل خان کے قریب پہنچ چکا تھا۔ پُل پر لیٹے ہی لیٹے اُس نے رائفل سیدھی کی اور گولی چلا دی۔ گولی سانڈل خان کے کان کو چھوتی ہوئی پیچھے چٹان سے جا ٹکرائی۔ عبدل زمین پر لیٹ گیا۔ سانڈل خان نے رسّے پر ایک زوردار ضرب لگائی اور رسّہ کٹ گیا۔

رسّے کے ٹوٹنے کے ساتھ ہی نالے کا پُل ٹوٹ کر گر پڑا اور اُس کے ساتھ ہی سارے کے سارے جاپانی سپاہی نالے

کی تیز رفتار موجوں میں غرق ہو گئے۔ کنارے پر بچے کھچے جاپانیوں
نے انہیں بچانے کے لیے نالے میں چھلانگیں لگا دیں۔
اب عبدل اور ساندل خان کے لیے وہاں ٹھہرنا فضول تھا۔
وہ جاپانیوں کو نالے کی پُر شور لہروں میں ڈوبتا اُبھرتا زیادہ دیر
نہیں دیکھ سکتے تھے۔ کیونکہ اس بات کا امکان موجود تھا کہ وہ
نالہ عبور کر کے اس کنارے پر آ جائیں اور اُن دونوں کو اپنی
گولیوں کی زد میں لے لیں۔ چنانچہ وہ ایک بار پھر جنگل میں ایک
طرف دوڑ پڑے۔

سارا دن وہ دونوں بہادر انسان جنگلوں میں سفر کرتے رہے۔
کبھی وہ دوڑتے۔ تھک جاتے تو گھڑی دو گھڑی کے لیے سستا
لیتے۔ چشمے کا پانی پیتے اور پھر دوڑنا شروع کر دیتے۔ خوشی کی
بات یہ تھی کہ ساندل خان اُس جنگل سے واقف تھا۔ جنگ میں
اُس نے جنگل کا چپہ چپہ چھان مارا تھا۔ اس اعتبار سے وہ
ٹھیک راستے پر چل رہے تھے۔ ایک جگہ پہنچ کر ساندل خان
رُک گیا اور پتھر پہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

"یہاں ہم تھوڑی دیر آرام کریں گے بچُو جی۔"

پاس ہی پانی کا ایک ننھا سا چشمہ بہہ رہا تھا۔ میٹھا شفاف
پانی چٹان کے سُرخ پتھروں میں سے چاندی کی طرح اُچھل اُچھل
کر باہر آ رہا تھا۔ انہوں نے ٹھنڈے پانی سے اپنی پیاس بجھائی

غُسل کیا۔ کپڑے دھو کر گیلے ہی پہن لیے۔ اب انہیں بھوک لگ
رہی تھی۔ انہوں نے پچھلی رات سے کچھ نہیں کھایا تھا۔
ساندل کہنے لگا۔

"بھوک مجھے بھی لگ رہی ہے۔ بھوک تمہیں بھی لگی ہوگی
مگر بچُو جی! اس جنگل میں جہاں سے ہم گزر رہے ہیں سوائے
مہاگنی کی کڑوے سیاہ درختوں کی چھال اور زہریلی گھاس کے ہمیں
اور کچھ نہیں مل سکتا۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ یہاں پانی کی نعمت میسر
آ گئی۔"

عبدل نے پوچھا۔

"کیا یہاں کہیں کیلے کے درخت نہیں ہیں؟"

"جنگلی کیلے کے درخت بھی کسی نہ کسی آبادی کے قریب ہوتے
ہیں اور آبادی یہاں کہیں بھی نہیں۔ ہاں۔ یہاں سے جنوب
مشرق کی جانب ایک قبیلہ آباد ہے۔"

"وہ یہاں سے کتنی دُور ہے؟" عبدل نے پوچھا۔

"اگر ہم گھاٹیوں میں سے ہو کر جائیں تو ہم کل صبح وہاں
پہنچ سکتے ہیں۔"

"اور اگر پہاڑیوں پر سے ہو کر جائیں تو؟"

"پہاڑیوں پر راستہ بڑا دشوار گزار ہے۔ اس کے علاوہ
وہاں جنگلی درندے بھی کثرت سے ہیں۔"

"کیا ان گھاٹیوں میں درندے نہیں ہوں گے؟"

ساندل نے گھاٹیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"ان گھاٹیوں میں برما کے شیروں اور چیتوں کی بہت سی کچھاریں تھیں اور راتوں کو جنگل ان کی دھاڑوں سے گونجا کرتے تھے لیکن جنگ شروع ہونے کے بعد توپوں کے گولوں اور بموں کے دھماکوں کی وجہ سے شیر چیتے اور دوسرے جنگلی درندے یہاں سے بھاگ کر اوپر پہاڑوں پر چلے گئے ہیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں ان گھاٹیوں میں سے ہی گزرنا ہوگا۔"

"ہاں۔ کمر ہمت باندھو۔ اللہ پر بھروسہ رکھو اور میرے ساتھ ساتھ چل پڑو۔ انشاء اللہ ہم صبح تک کاشان قبیلے کے گاؤں میں پہنچ جائیں گے۔"

"کہیں وہ آدم خور قبیلہ تو نہیں ہے؟"

ساندل خان ہنس پڑا۔

"نہیں۔ کاشان آدم خور نہیں ہیں۔ لیکن وہ بڑے خونخوار لوگ ہیں۔ دشمن کی گردن قلم کر کے اپنی جھونپڑی کے دروازے پر لٹکا دیتے ہیں۔"

عبدل نے ذرا ذرا ڈرتے ہوئے کہا۔

"وہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟"

ساندل خان نے عبدل کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"بچو جی! گھبراؤ نہیں۔ کاشان قبیلے کا سردار میرا دوست ہے۔ میں نے اس کی جوان لڑکی ساتن کو ایک جاپانی سپاہی کے چنگل سے چھڑا کر اس کی عزت بچائی تھی۔ پچھلے مہینے کی بات ہے۔ میں گوریلا ڈیوٹی پر جنگل میں گھوم رہا تھا کہ مجھے ایک لڑکی کی چیخ کی آواز سنائی دی۔ میں جھاڑیوں میں چھپتا چھپاتا چیخ کی آواز کی طرف گیا تو میں نے دیکھا ایک جاپانی سپاہی کاشان قبیلے کی ایک خوبصورت لڑکی پر ظلم کر رہا ہے۔ جاپانی کی پشت میری طرف تھی۔ میرے پاس اسلحہ وغیرہ سب کچھ تھا۔ لیکن میں گولی نہیں چلانا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنا چھرا نکالا۔ لپک کر جاپانی سپاہی کو گردن سے دبوچا اور ایک سیکنڈ کے اندر اندر چھرے سے اس کا گلا کاٹ دیا۔ ظالم جاپانی بے جان ہو کر گرا اور تڑپنے کے بعد ٹھنڈا ہو گیا۔ لڑکی سہم کر ایک طرف کھڑی تھی اور میری طرف یوں دیکھ رہی تھی جیسے اسے مجھ سے بھی ظلم کی توقع ہو۔ میں کاشان قبیلے کی تھوڑی زبان جانتا ہوں۔ میں نے اس سے اس کی زبان میں بات کی تو وہ حیران رہ گئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ میں قبیلے کے سردار کی بیٹی ہوں۔ جنگل میں نہانے آئی تھی کہ اس جاپانی سپاہی نے مجھے پکڑ لیا۔ میں اس لڑکی جس کا نام ساتن

تھا اپنے ساتھ لے کر اُس کے باپ مونگو کے پاس آ گیا۔ مونگو
قبیلے کا سردار تھا۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ میں نے اپنی جان
پر کھیل کر اُس کی بیٹی کی عزت بچائی ہے تو اُس نے مجھے اپنے
سینے سے لگا لیا۔ میری بہت زیادہ خاطر مدارت کی۔ دو دن
زبردستی مہمان رکھا اور کہا کہ زندگی میں کبھی کسی قسم کی مدد
کی ضرورت ہو تو مجھے ضرور یاد کرنا۔ تم نے میری بیٹی کی
عزت بچائی ہے۔ میں تمہارے لیے اپنی جان بھی قربان کر
سکتا ہوں۔"

عبدل یہ کہانی سُن کر بہت خوش ہوا۔ اس خیال سے بھی
کہ ساندل ایک بہادر اور غیرت مند نوجوان تھا۔ وہ دوسروں کی
بہن بیٹی کی عزت اپنی بہن اور بیٹی کی عزت کے برابر سمجھتا تھا
اور دوسرے اس خیال سے بھی اُسے حوصلہ ہوا کہ کاشان قبیلے کا
سردار ساندل خان کا دوست ہے اور وہاں انہیں کوئی گزند
نہیں پہنچے گا۔ ساندل خان نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"اب ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ سفر طویل ہے اور
وقت گزر رہا ہے۔"

دونوں اُٹھے اور اللہ کا نام لے کر انہوں نے گہری گھاٹیوں
میں اپنا سفر ایک بار پھر شروع کر دیا۔

یہ گھاٹیاں قسم قسم کے پتھروں، پتھروں کی سِلوں، چورس

چٹانوں، سنگلاخ پہاڑی ڈھلانوں اور جنگلی گھاس سے اٹی پڑی
تھیں۔ ساندل نے راستے میں کئی جگہوں پر سانپ مارے۔ زہریلے
بچھوؤں کو پاؤں سے کچل کر ہلاک کیا۔ چلتے چلتے انہیں شام
ہو گئی۔ اب انہیں سخت پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ مگر گھاٹی خشک
اور بنجر تھی۔ وہاں پانی کا نام و نشان تک نہ تھا۔

ساندل نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے اُن درختوں کے جھنڈ میں پانی کا چشمہ موجود
ہے۔ آؤ چل کر دیکھتے ہیں۔"

درختوں کا یہ جھنڈ ایک ٹیلے کے ڈھلوان پر ذرا اُوپر جا کر
تھا۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ساندل خان کا اندازہ بالکل صحیح
تھا۔ پتھروں میں سے ایک جگہ سے پانی رس رہا تھا اور چھوٹی سی
تلیا بن گئی تھی۔ انہوں نے پانی پی کر اپنی پیاس بجھائی اور سفر
دوبارہ شروع کر دیا۔ اب جنگل کی گہری گھاٹیوں میں رات کے
سائے بڑھنے لگے تھے۔ اندھیرا چاروں طرف پھیلنا شروع ہو
گیا تھا۔ عبدل نے کہا۔

"کیا ہم آرام کیے بغیر رات بھر اسی طرح چلتے رہیں گے؟"

"کیوں نہیں۔ ہمیں رات بھر چلنا ہو گا۔ راتوں رات اِن
دشوار گزار گھاٹیوں کو عبور کریں گے تو صبح کاشان قبیلے تک پہنچیں
گے۔ کیا تم رات کو سفر نہیں کرنا چاہتے؟"

سانڈل نے عبدل سے پوچھا۔ عبدل نے بے دلی سے مسکرا کر کہا۔

"مصیبتیں برداشت کرتے کرتے اب میں سخت جان ہو گیا ہوں۔ اگر آپ کی یہی خواہش ہے کہ ہم رات کو آرام نہ کریں تو میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

سانڈل نے عبدل کے سر پہ ہاتھ پھیر کر کہا۔

"شاباش بیٹے! مجھے تم سے یہی اُمید تھی۔ انسان کو دلیری اور جواں مردی سے ہر تکلیف کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ جو لوگ بچپن ہی سے سخت جانی کے عادی ہو جاتے ہیں انہیں بڑا ہو کر بہت آرام ملتا ہے۔ پھر جب وہ کسی مصیبت میں پھنس جائیں تو انہیں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ وہ بڑے آرام سے مصیبت کے دریا کو عبور کر جاتے ہیں۔ ہم یقیناً اپنا سفر جاری رکھیں گے۔ ویسے اگر تم چاہو تو ہم گھنٹے دو گھنٹے کے لیے کسی جگہ بسرام کر لیں گے۔"

عبدل نے کوئی جواب نہ دیا اور قدم آگے بڑھاتا رہا۔ لیکن سانڈل خان کو یہ بات اچھی نہ لگی کہ وہ ایک بھولے بھالے نوعمر لڑکے سے اس قدر مشقت کا کام لے۔ چنانچہ رات کا پہلا پہر گزر جانے کے بعد اُس نے ایک جگہ رُک کر کہا۔

"میں بھی تھک گیا ہوں یار۔ میرا خیال ہے ہم تھوڑی

دیر آرام کر لیں۔ اب ہم ویسے بھی جاپانیوں سے بہت دُور نکل آئے ہیں۔"

عبدل نے بہت کہا کہ نہیں نہیں وہ آرام نہیں کرنا چاہتا۔ مگر سانڈل نہ مانا اور وہ رُک گئے۔ انہوں نے ایک جگہ سے بہت سی گھاس توڑ کر چٹان پر دو بستر بنا لئے اور اُس پر لیٹ گئے۔ سانڈل خان بولا۔

"تم اب آرام سے سو جاؤ۔ میں بھی سونے کی کوشش کروں گا۔ فکر مت کرنا۔ اِدھر کوئی جنگلی درندہ نہیں رہتا۔"

عبدل نے مسکرا کر کہا۔

"اگر ہم جاپانی درندوں سے بچ کر یہاں آ گئے ہیں تو جنگلی درندہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"یہ بھی ٹھیک بات ہے۔ اچھا اب سو جاؤ۔"

جنگل کی رات بڑی ہی خاموش تھی۔ آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ جہاں وہ گھاس کے بستروں پر لیٹے تھے وہاں اُن کی دونوں جانب پہاڑوں کی ڈھلانیں اُوپر تک چلی گئی تھیں۔ اُوپر پہاڑوں کی چوٹیوں پر ستارے چاندی کے پھولوں کی مانند جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔ عبدل کو خیال آیا کہ ان پہاڑوں کے اُوپر گھنے جنگل ہیں۔ اور سانڈل نے کہا تھا کہ شیر اور چیتے توپوں اور بموں کے دھماکوں سے ڈر کر اِن جنگلوں کی طرف بھاگ گئے ہیں۔

تو کیا اوپر جنگلوں میں شیر اور چیتے رہتے ہیں؟ اگر وہ رات کو اتر کر نیچے آ گئے تو؟ عبدل کے جسم میں ایک جھرجھری سی پیدا ہوئی۔ پھر وہ گہری نیند میں کھو گیا۔

خدا جانے وہ کتنی دیر تک سویا رہا۔ جب اس نے آنکھ کھولی تو آسمان پر صبح کی نیلی نیلی روشنی پھیل چکی تھی۔ پہاڑ کی چوٹیوں کے اوپر آسمان پر تارے پھیکے پڑنے لگے تھے۔ ساندل خان ایک طرف چٹان پر نماز پڑھنے میں مصروف تھا۔ عبدل کو خیال آیا کہ نماز تو اسے بھی پڑھنی چاہیئے۔ وہ بھی مسلمان ہے اور خدا نے ہر مشکل وقت میں اس کی مدد کی ہے اور اس نے کبھی اپنے خدا کی عبادت نہیں کی۔ وہ اٹھا۔ چشمے پر جا کر اس نے منہ ہاتھ دھویا۔ وضو کیا اور نماز کی نیت باندھ لی۔ نماز پڑھ کر اسے بڑا سکون حاصل ہوا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اللہ میاں نے اس کی ساری دعائیں قبول کر لی ہیں۔ ساندل بھی نماز سے فارغ ہو گیا تھا اور اب دعا مانگ رہا تھا۔ دعا مانگ کر اس نے مسکرا کر عبدل کی طرف دیکھا۔

"بچہ جی! نماز ضرور پڑھا کرو۔ نماز پڑھنے سے انسان کا دل پاک اور دماغ روشن ہو جاتا ہے۔ اس کے خیال نیک اور پاکیزہ ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ خدا سے جو بھی اچھی چیز مانگے اللہ میاں اسے عطا کر دیتا ہے۔ شاباش! تمہیں نماز پڑھتے

دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی ہے۔ آؤ اب آگے چلیں۔ ابھی کافی سفر باقی ہے۔"

وہ پھر پاؤں پیدل سفر پر روانہ ہو گئے۔

دوپہر سے پہلے پہلے وہ گھاٹیوں میں سے باہر نکل آئے۔ اب وہ جنگل کے ایک بہت بڑے سلسلے میں سے گزر رہے تھے۔ راستے میں انہوں نے دو تین ایسے پہاڑی نالے عبور کئے جن کے بیچ میں بڑے بڑے زنگ آلود پتھر پڑے تھے اور پانی کی لہریں ان سے ٹکرا کر شور مچاتی گزر رہی تھیں۔ بھوک سے عبدل کا برا حال تھا۔ ساندل بولا۔

"بس اب ہم کاشان قبیلے کے قریب پہنچ چکے ہیں۔"

دوپہر کے بعد وہ جنگل میں سے نکل کر باہر آئے تو سامنے ایک کھلا میدان تھا جس میں دھان کی فصل بوئی ہوئی تھی۔ کھیتوں کا یہ سلسلہ پہاڑی ڈھلانوں کے ساتھ ساتھ دور تک چلا گیا تھا۔ ایک پہاڑی کے عقب میں دور دھوئیں کی پتلی سی لکیر اٹھ رہی تھی۔

ساندل کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے دھوئیں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عبدل سے کہا۔

"یہ دھواں قبیلے والوں کی جھونپڑیوں سے اٹھ رہا ہے ہم منزل پر پہنچ گئے ہیں۔"

عبدل کا مُرجھایا ہوا چہرہ بھی ایک پل کے لیے خوشی سے کِھل اُٹھا۔ بھوک کی وجہ سے اُس کی انتڑیاں قُل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ لیکن ساندل کی وجہ سے وہ صبر کئے ہوئے تھا۔ کیونکہ اُس نے بھی دو روز سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ عبدل نے ایک جگہ سے دھان توڑ کر منہ میں ڈالا تو ساندل بولا۔

"منزل کے قریب آ کر ہمت مت ہارو۔ جہاں اتنا صبر کیا ہے تھوڑا صبر اور کر لو۔ قبیلے میں پہنچ کر تمہاری قسم قسم کے میٹھے پھلوں اور تیتر کے گوشت سے خاطر تواضع ہو گی۔"

"شکریہ خان جی! میں آپ کی یہ نصیحت بھی کبھی نہیں بھولوں گا۔"

ڈھلان کے ساتھ ساتھ کھیتوں میں چلتے ہوئے جب انہوں نے ٹیلے کا موڑ کاٹا تو سامنے کاشان قبیلے کی کتنی ہی جھونپڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ اُنہیں دیکھ کر عبدل کو محسوس ہوا گویا اُس کے مُردہ جسم میں ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی ہے۔

باب ۸

خوش آمدید! ـــــ الوداع

ابھی وہ جھونپڑیوں کے قریب نہیں پہنچے تھے کہ ٹیلے کی جانب سے سَن کی آواز کے ساتھ یکے بعد دیگرے دو تیر آئے اور اُن کے آگے زمین پر آ کر کُھب گئے۔ عبدل پریشان ہو گیا۔ لیکن ساندل مسکراتا رہا۔ اتنے میں تین چار جنگلی آدمی پتّوں کا لباس پہنے۔ سروں پر پتّوں کے تاج سے پہنے چھلانگیں لگاتے ہوئے نمودار ہوئے اور نیزے تان کر اُن کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ساندل اور عبدل خاموش اپنی جگہوں پر کھڑے رہے۔ ساندل نے ایک ہاتھ اُوپر اُٹھا کر اپنے سینے پر رکھ دیا۔ اس پر ایک جنگلی آگے بڑھا۔ اُس نے ساندل خان کو پہچان لیا تھا۔ اُس جنگلی نے نیزہ ہوا میں لہرا کر ایک نعرہ لگایا اور ساندل کی بغل میں ہاتھ ڈال دیا۔

باقی سارے جنگلی لوگ بھی مسکرانے لگے۔ عبدل نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اُن جنگلیوں نے ساندل خان کو پہچان لیا تھا۔ وہ اُنہیں جلوس کی شکل میں لے کر آگے بڑھے۔ جھونپڑیوں کے درمیان مُرغیاں اِدھر اُدھر چل پھر کر دانہ دُنکا چُن رہی تھیں۔

کچھ بوڑھی عورتیں لکڑی کے بڑے بڑے اوکھلوں میں دھان
کوٹ رہی تھیں۔ ایک جانب کچھ مرد بیٹھے پٹ سن کی رسیاں
بُن رہے تھے۔ جھونپڑیوں کی چھتوں پر ناریل کاٹ کر سوکھنے
کے لیے ڈال رکھا تھا۔ سارے قبیلے میں اجنبی مہمانوں کی آمد کی
خبر فوراً پھیل گئی۔ بچے، بوڑھے، مرد، جوان عورتیں، لڑکیاں
سبھی جھونپڑیوں سے باہر نکل آئے۔ اور ساندل خان کو خوشی
سے دیکھنے لگے۔ عبدل کو اب محسوس ہوا کہ ساندل خان کو وہاں
قبیلے کا بچہ بچہ جانتا تھا۔ قبیلے کے سردار کو خبر ہوئی تو وہ بھی اپنی
شاندار جھونپڑی سے باہر نکل آئے۔

اُس نے دُور ہی سے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے اور ساندل خان
کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ پھر دونوں کاشائی زبان میں باتیں کرنے
لگے۔ سردار نے عبدل کی طرف دیکھ کر اشارہ کر کے کچھ پوچھا۔
ساندل خان نے اُن کی زبان میں مسکرا کر کچھ کہا۔ سردار قہقہہ لگا کر
ہنس پڑا اور اُس کے زرد زرد لمبے دانت سارے کے سارے
دکھائی دینے لگے۔ پھر اُس نے آگے بڑھ کر عبدل کو پیار کیا۔ اِس
کے فوراً بعد دیکھتے ہی دیکھتے زمین پر کیلے کے بڑے بڑے سبز
پتوں کا دسترخوان بچھ گیا اور اُس پر طرح طرح کے پھل اور مختلف
جانوروں کے بھُنے ہوئے گوشت کے ٹکڑے سج گئے۔ پھلوں میں
سرخ سرخ میٹھا تربوز، سفید ناریل، زرد کیلے کے گچھے، سنہری

اناناس اور مینگوسٹین تھے۔ اس کے ساتھ مچھلی اور ہرن کا گوشت
تھا۔ اُبلی ہوئی شکرقندی بنی تھی۔ لکڑی کے تھال میں اُبلے ہوئے
چاولوں میں سے خوشبودار بھاپ اُٹھ رہی تھی۔

سارے قبیلے والے کیلے کے پتوں کے دسترخوان کے آمنے سامنے
پالتی مار کر بیٹھ گئے اور دعوت شروع ہو گئی۔ سردار کی بیٹی سارتن
اور اُس کی بیوی بھی سردار کے پاس بیٹھی تھی۔ سب لوگ کھا بھی
رہے تھے اور زور شور سے باتیں بھی کر رہے تھے۔ سردار اور
اُس کے قبیلے کے لوگ جنگلی وحشیوں کی طرح دونوں ہاتھوں سے
کھا رہے تھے۔ عبدل کو بے حد بھوک لگی تھی۔ مگر کھانا اس
قدر زیادہ تھا کہ بہت جلد اُس کا جی بھر گیا۔

ساندل خان نے کہا۔

"بچو جی! بہت بھوک بھوک کر رہے تھے۔ اب کھاتے کیوں
نہیں؟"

عبدل نے ہنس کر تھوڑا تھوڑا کھانا شروع کر دیا۔

کھانے کے بعد ناریل کے پیالوں میں کالی سیاہ چائے کا دَور
چلا۔ یہ چائے اس قدر کڑوی تھی کہ عبدل کے حلق میں سے
نہیں اُتر رہی تھی۔ ساندل خان نے عبدل کو منہ بناتے ہوئے
دیکھا تو جھڑک کر بولا۔

"خبردار۔ اگر بُرا منہ بنایا۔ یہ لوگ بُرا مان جائیں گے چپکے

سے پی جاؤ چائے۔"

اور عبدل کڑوے گھونٹ بڑی خاموشی سے پی گیا۔

چائے کے دَور پر دَور چل رہے تھے۔ موٹا تازہ بھینسے ایسا سردار چائے کی خدا جانے کتنی پیالیاں پی گیا تھا۔ عبدل کی آنکھوں کے سامنے اُس نے چار سالم بھُنے ہوئے تیتر، چھ جنگلی کبوتر، ایک پُوری مچھلی، دو اناناس، نصف درجن کیلے اور ایک تربوز کھایا تھا۔ اب وہ چائے کی پیالی پر پیالی پیئے جا رہا تھا۔ مردوں کے مقابلے میں عورتوں نے اتنا زیادہ نہیں کھایا تھا۔ جب مرد کھانے سے فارغ ہو چکے تو بچوں اور بوڑھی عورتوں کی باری آئی۔ ساندل خان قبیلے کے سردار کو جاپانیوں کی قید اور وہاں سے فرار کی داستان سُنا رہا تھا جسے قبیلے کا سردار اور دوسرے جنگلی بڑی دلچسپی سے سُن رہے تھے اور ساندل اور عبدل کی بہادری پر قہقہے لگا لگا کر انہیں شاباش دے رہے تھے۔ یہ محفل شام تک جاری رہی۔

رات کو مہمانوں کی خوشی میں رقص کی محفل لگی۔

عورتوں اور مردوں نے اپنے جسموں پر طرح طرح کے شوخ رنگ ملے۔ گلے میں پھولوں کی مالائیں ڈالیں۔ سروں پر کلیوں کے تاج سجائے اور ڈھول کی تھاپ پر گانے اور رقص کرنے لگے۔ عورتیں ایک طرف تھیں اور مرد دوسری طرف۔ سب نے ایک دوسرے کے

ہاتھ میں ہاتھ دے رکھے تھے اور عجیب قسم کی آوازیں نکال کر ڈانس کر رہے تھے۔ عبدل زندگی میں پہلی بار ایک جنگلی قبیلے کا ناچ دیکھ رہا تھا۔ ایک عورت نے عبدل کا ہاتھ پکڑ کر اسے زبردستی کھینچ لیا۔ سب لوگ قہقہے لگا کر ہنسنے لگے۔ عبدل شرما گیا۔

ساندل خان نے ڈانٹ کر کہا۔

"خبردار، اگر ناچنے سے انکار کیا عبدل۔ جو آدمی ان کے ناچ کی دعوت ٹھکرا دے یہ اُسے کچا چبا جاتے ہیں۔"

عبدل کی جان عجیب مصیبت میں پھنس گئی تھی۔ پہلے بڑی مشکل سے اُس نے کالی سیاہ کڑوی چائے کے گھونٹ زہر مار کئے تھے اور اب اُسے سارے لوگوں کے سامنے ایک جنگلی عورت کے ساتھ بے شرمی کے انداز میں ڈانس کرنا پڑ رہا تھا۔ اُس نے زندگی میں کبھی رقص نہیں کیا تھا۔ ویسے بھی ہماری زندگی میں اور ہمارے معاشرے میں بھلا کون ڈانس کرتا ہے۔ ڈانس کرنے والی عورتوں اور مَردوں کو ہمارے ہاں اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ مگر جنگلی قبیلے کے لوگ ڈانس اور رقص کے بڑے شیدائی ہوتے ہیں۔ ناچ میں وہ اپنے قبیلے کی پرانی کہانیاں بیان کر جاتے ہیں۔ یہ کہانیاں، دلیری، جوانمردی اور دشمن پر حملہ کر کے اُس پر فتح پانے کی کہانیاں ہوتی ہیں۔

عبدل بے چارہ بادل نخواستہ جنگلی عورت کا ہاتھ ہاتھ میں تھام کر ناچنے لگا۔ اُس کے پاؤں غلط اُٹھ رہے تھے اور غلط نیچے پڑ رہے تھے۔ وہ کئی بار عورت کے پاؤں میں اُلجھ رہے تھے۔ عورت ہنس رہی تھی اور عبدل کا ہاتھ کھینچ کھینچ کر اُسے اپنے ساتھ نچوا رہی تھی۔ پھر رقص کی لے تیز ہو گئی۔ ڈھول کی تھاپ بھی تیز ہو گئی اور سارے جنگلی مردوں اور عورتوں نے پاگلوں کی طرح ایک گول چکر میں رقص کرنا شروع کر دیا۔ عبدل بھی اِس گول چکر میں پھنس گیا تھا اور یوں گھوم رہا تھا جیسے پانی کے بھنور میں پھنسا ہوا تنکا چکر کھایا کرتا ہے۔ اُس کا سر چکرانے لگا۔ قریب تھا کہ وہ نڈھال ہو کر گر پڑے کہ ناچ ختم ہو گیا۔

اُس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اُس کا سر چکرا رہا تھا اور پاؤں زمین پر ٹھیک نہیں پڑ رہے تھے۔ سانڈل خان کے پاس آتے آتے وہ کئی بار لڑھک کر زمین پر گرا۔ اور سارے لوگ ہنس ہنس کر اُس سے ہنسی ٹھٹھول کرنے لگے۔ سردار نے سانڈل سے کوئی بات کی۔ سانڈل نے قہقہہ لگا کر عبدل سے کہا۔

"جانتے ہو سردار کیا کہتا ہے؟ سردار کہتا ہے کہ عبدل کو یہیں چھوڑ جاؤ۔ ہم اسے جنگلی بنا دیں گے۔ اِسے ڈانس بھی سکھا دیں گے۔ پھر اِس کی شادی بھی کر دیں گے۔"

سانڈل قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"بولو کیا خیال ہے عبدل؟ میں سردار سے حامی بھر لوں؟"

عبدل نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"خدا کے لیے ایسا نہ کریں خان جی! میں واپس اپنے گاؤں جانا چاہتا ہوں۔ میں یہاں نہیں رہ سکتا۔"

سانڈل خان نے عبدل کے جواب کا کاشانی زبان میں ترجمہ کر کے سردار کو سنایا تو ہر طرف قہقہوں کا ایک شور بلند ہوا۔ سردار نے اپنی ران پر ہاتھ مار کر کچھ کہا جس کا ترجمہ یہ تھا کہ:

"دیوتاؤں کی قسم یہ لڑکا اپنے گاؤں سے اتنا پیار کرتا ہے تو یہ سچا ہے۔ یہ جہاں بھی رہے ہم اسے اپنا بچہ ہی سمجھیں گے۔"

عبدل کو ترجمہ سنایا گیا تو اُس نے جی ہی جی میں خدا کا شکر ادا کیا کہ سردار نے اُس کی جان بخشی کر دی اور اُسے قبیلے میں شامل کر لینے پر اصرار نہیں کیا کیونکہ اگر وہ اصرار کرتا تو بقول سانڈل خان وہ انکار نہیں کر سکتا تھا اور اُسے مجبوراً عبدل کو وہاں چھوڑ کر جانا پڑتا۔

وہ سوچنے لگا کہ یہ قبیلوں کی زندگی بھی عجیب ہوتی ہے۔ یہ لوگ جنگلی ہوتے ہیں۔ وحشی ہوتے ہیں۔ غیر مہذب ہوتے ہیں۔ لیکن کس قدر بہادر، دلیر، سچے، دوست پرست اور سچائی کی خاطر جان بھی قربان کر دینے والے ہوتے ہیں۔ پھر بھی شہروں میں رہنے والے اِن جنگلیوں کے بعض اچھے اصولوں کی تعریف کر سکتے

ہیں مگر اُن کے ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ انسان
نے لاکھوں برس کی جدوجہد کے بعد جنگلی زندگی سے نکل کر شہروں
کو آباد کیا ہے۔ نئی تہذیب اور نئے اخلاق کو سنوارا ہے۔
اب ہر انسان کا یہی فرض ہے کہ وہ اپنی تہذیب، اپنے شہر،
اپنے گھر، اپنے معاشرے اور ماحول میں رہ کر اخلاقی قدروں کی
حفاظت کرے اور انسانوں کی خدمت کر کے انسانی معاشرے
کو بلندی کی طرف لے جائے۔

کاشان قبیلے والوں کی مہمان نوازی اور خدمت و محبت سے
عبدل کے سارے پرانے زخم بھر گئے۔ جسم کی ساری تکان اتر
گئی۔ وہ پھر سے تازہ دم اور صحت مند ہو گیا۔ جاپانیوں کی قید
میں دی گئی اذیتوں کے صرف نشان ہی باقی رہ گئے تھے۔ وہ سارا
دن قبیلے کے دوسرے لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ سیر و تفریح
میں بسر کرتا۔ تالاب پر مچھلیاں پکڑتا، رسیاں بٹتا، ناریل کی چھال
اتارتا، تیر کمان چلاتا اور نیزہ بازی سیکھتا۔ اُس نے تیر چلا کر
پرندوں کا شکار کرنا بھی سیکھ لیا تھا۔ اُسے تھوڑی تھوڑی کاشان
قبیلے والوں کی زبان بھی سمجھ میں آنے لگی تھی۔ سردار کی بیٹی ساتن
عبدل سے بہت پیار کرتی تھی۔ وہ اُسے اپنے ہاتھ سے اُبلے
ہوئے چاول اور ہرن کا گوشت کھلاتی۔ یہ لوگ ایک ہی دن میں
جنگل سے بہت سا شکار مار کر لے آتے۔ اُن کے نشانے اس

قدر سچے تھے کہ کیا مجال اُن کی کمان سے نکلے ہوئے تیر سے
کوئی پرندہ یا جنگلی جانور بچ کر نکل جائے۔

ایک روز قبیلے میں بڑی گہما گہمی سی نظر آنے لگی۔ معلوم ہوا
کہ آج سردار شیر کے شکار کو جا رہا ہے۔ انہوں نے ساندل کو بھی
ساتھ چلنے کی دعوت دی جو اُس نے قبول کر لی۔ یا اُسے قبول کرنی
پڑی۔ اس لیے کہ اِن جنگلیوں کا کوئی پتہ نہیں تھا کہ کس بات پر
خوش ہو کر گلے سے لگا لیں اور کس بات پر آگ بگولا ہو کر گردن
اڑا دیں۔ عبدل ان جنگلیوں کے گلے لگنے کو تو تیار تھا لیکن اُن کے
چھُروں سے اپنی گردن اُڑتی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ چنانچہ جب اُسے
بھی شیر کے شکار پر ساتھ چلنے کی دعوت دی گئی تو وہ انکار نہ کر
سکا۔ اُن جنگلیوں کے پاس کوئی بندوق یا رائفل نہیں تھی۔ معلوم
ہوا کہ سردار شیر کا شکار چھُرے اور نیزے سے کرے گا۔

یہ بات بڑی بہادری کی تھی۔ عبدل کو معلوم ہوا کہ کاشان
قبیلے کے لوگ شیر کا شکار اسی طرح کرتے ہیں۔ دوپہر تک شکاریوں
کی جماعت تیار ہو کر اُوپر پہاڑ والے جنگلوں کی طرف روانہ ہو
گئی۔ چڑھائی بڑی ناہموار اور مشکل تھی۔ مگر جنگلی یوں مزے سے
اُوپر چڑھتے جا رہے تھے جیسے شہر کی پکی سڑک پر سے گزر رہے
ہوں۔ عبدل کو بھی اُن کے ساتھ ساتھ اُوپر چڑھنا پڑ رہا تھا۔
کافی اُوپر جا کر ایک وسیع میدان آگیا جو اُونچے اُونچے گھنے درختوں

سے بھرا ہوا تھا۔ عبدل حیران ہوا کہ پہاڑ کی چوٹی پر بھی اتنا
اور گنجان جنگل تھا کہ بمشکل سورج کی روشنی زمین تک پہنچ رہی
تھی۔ جس مقام پر ہانکا کر کے شیر کو لانا اور اُس کا شکار کرنا تھا
وہاں پہلے ہی سے درختوں پر مچانیں باندھ دی گئی تھیں۔ ہانکا
کرنے والے ڈھول کنستر لے کر جنگل میں ایک طرف چلے گئے۔ باقی
لوگ درختوں کے موٹے موٹے تنوں کے پیچھے چھپ گئے۔ سانول
خان، عبدل اور کچھ بوڑھے جنگلی مچانوں پر چڑھ کر بیٹھ گئے۔

سردار بھی ایک درخت کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ اب
شیر کا انتظار ہونے لگا۔ سردار نے نیزہ لہرایا۔ مچان پر بیٹھے
ہوئے ایک جنگلی نے چیخ مار کر اپنی زبان میں کسی شے کا اعلان
کیا اور اس کے ساتھ ہی جنگل میں ہر طرف گہری خاموشی چھا گئی۔
کہاں تو یہ تھا کہ سارا جنگل جنگلیوں کے گانوں اور آوازوں سے
گونج رہا تھا اور کہاں اب یہ عالم تھا کہ ہر طرف خاموشی طاری
تھی۔ سوائے درختوں پر بولنے والے پرندوں کے اور کوئی آواز
سنائی نہیں دے رہی تھی۔ یہ سناٹا کوئی پندرہ بیس منٹ تک
رہا۔ پھر ایکا ایکی دور سے ہانکا کرنے والوں کے ڈھول کنستر پیٹنے
کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یہ شور جنگل میں تین طرف بلند ہو رہا
تھا جس میں اُن کے جنگلی گانوں کی آواز بھی شامل تھی۔ چوتھی سمت
مچان بندھی تھی۔ ہانکا کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ جو کہ ہانکا

کرنے میں بڑے ماہر ہوتے ہیں ڈھول کنستر پیٹتے ایک نصف
دائرے کی شکل میں جنگل میں داخل ہوتے ہیں اور شور مچاتے
آہستہ آہستہ شیر کی کچھار کے قریب آتے جاتے ہیں۔

شیر ان آوازوں سے گھبرا کر اپنی کچھار سے باہر نکل آتا ہے
اور جدھر سے شور نہیں آ رہا ہوتا اُس طرف بھاگنا شروع کر
دیتا ہے۔ شیر ایک بہادر درندہ ہے۔ لیکن وہ زیادہ آدمیوں کو
شور مچاتا دیکھ کر گھبرا جاتا ہے۔ ہانکا کرنے والے آہستہ
آہستہ ڈھول کنستر پیٹتے ہوئے اپنا دائرہ تنگ کرتے جاتے
ہیں اور شیر اُن کے آگے آگے بھاگتا ہوا اُس مقام پر آ جاتا ہے
جہاں شکاری مچان پر بندوق لئے بیٹھا اُس کا انتظار کر رہا ہوتا
ہے۔ پھر شکاری بوکھلائے ہوئے شیر پر پے در پے فائر کر کے اُسے
ہلاک کر ڈالتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی شیر مشتعل ہو کر ایک ہی چھلانگ
میں مچان پر پہنچ جاتا ہے اور شکاری کی تکا بوٹی کر دیتا ہے۔ مگر
کاشان قبیلے کا سردار تو زمین پر کھڑے ہو کر شیر کو ہلاک کرنے
آیا تھا۔ یہ کام بہت دلیری، بہادری اور خطرے کا تھا۔ اس میں
بہت کم اُمید اس بات کی تھی کہ شیر ہلاک ہو جائے۔ زیادہ خدشہ
شکاری کے خود ہلاک ہو جانے کا تھا۔ ہانکا کرنے والوں کا شور
ب قریب آ رہا تھا۔

پھر ایک دم سے جنگل میں ذرا دُور شیر کی دھاڑ گونجی۔ درختوں

پرے سارے پرندے پھڑپھڑا کر اڑ گئے۔ ساندل نے عبدل کا
ہاتھ دبا کر کہا۔

"شیر آ رہا ہے۔ گھبرا تو نہیں گئے؟"

عبدل نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

"بالکل نہیں۔"

انہوں نے ساندل خان کو اُس رات کا قصہ نہیں بتایا تھا جب
وہ رات بھر اکیلا درخت کی شاخ پر بیٹھا رہا تھا اور نیچے خونخوار
شیر اُسے ہڑپ کرنے کی فکر میں دھاڑتا رہا تھا۔ عبدل کے دِل میں
اب شیر کا وہ خوف اور اُس کی دہشت نہیں رہی تھی جو ایک انسان
کے دل میں شیر کو پہلی بار دیکھ کر یا اُس کی گرج سُن کر پیدا ہوتی
ہے۔ ہانکا کرنے والوں کا شور پہلے سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔
معلوم ہو رہا تھا کہ وہ شیر کی کچھار کے قریب پہنچ گئے ہیں اور
انہوں نے شیر کو آگے لگا لیا ہے۔

اب جو شیر کی دھاڑ سنائی دی تو معلوم ہوا کہ وہ بمشکل مچان
سے کوئی سو ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر ہے۔ ساندل خان ہونٹ
بھینچے نیچے تک رہا تھا۔ بوڑھے جنگلی پتھرائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ
خاموش مچان پر بیٹھے تھے۔ اُدھر درختوں کے پیچھے چھپے ہوئے
جنگلیوں اور سردار کی کچھ خبر نہ تھی۔ اُن کی جانب سے ہلکی سی آہٹ
بھی سنائی دے رہی تھی۔ یہ بات خاص طور پر مچان پر بیٹھنے والوں

کے بھی ذہن نشین کروا دی گئی تھی کہ کوئی بھی اپنی جگہ سے
نہ ہلے۔

شیر کی دھاڑ تیسری بار جنگل میں گونجی تو اس کے ساتھ ہی
وہ اُچھل کر درختوں میں نمودار ہوا۔ اب دس گیارہ فٹ لمبا، زرد
دھاریوں والا بھرپور جوان شیر بالکل مچان کے سامنے مہاگنی کے
درختوں کے نیچے کھڑا بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے دُم
ہلا رہا تھا۔ یک لخت ہانکا کرنے والوں کا شور ختم ہو گیا۔ یوں
محسوس ہوا جیسے وہ جنگل میں ہی کہیں گم ہو گئے ہیں۔ خاموشی
ہوئی تو شیر نے اطمینان سے ایک انگڑائی لی۔ پناہ خدا۔ اُس کا
بڑا سا منہ کھل گیا اور سوئے ایسے لمبے لمبے دانت نظر آئے۔

اب جو عبدل نے ایک منظر دیکھا تو اُس کی روح کانپ
گئی۔

مچان کے نیچے درختوں میں سے اچانک سردار باہر نکل آیا
تھا اور شیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آہستہ آہستہ اُس کی سمت
بڑھ رہا تھا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں چمکتا ہوا لمبا چھرا اور ایک
ہاتھ سے نگرمچھ کی سخت کھال سے بنی ہوئی ڈھال تھی۔ شیر
دوسری جانب اپنا شاہانہ سر اُٹھائے تک رہا تھا۔ اُس نے گردن
موڑی تو اُس کے سامنے ایک موٹا تازہ جنگلی آدمی چھرا تانے
کھڑا تھا۔ شیر نے اپنی خونخوار آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

شیر نے جنگل میں کئی بار آدمیوں کو اپنے ذرا قریب سے گزر
جانے کی اجازت دی تھی۔ اس نے انہیں کچھ نہ کہا تھا۔ لیکن اب
ایک آدمی بپھرا ہوا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسے ہلاک
کرنے کی نیت سے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ شیر کی توہین
ہی نہیں بلکہ اس کی غیرت اور شجاعت کو للکارا جا رہا تھا۔ شیر
ایسے موقعوں پر کبھی پیٹھ نہیں دکھاتا۔ چنانچہ جو انسان بھی ایسے
موقعوں پر پیٹھ نہ دکھائے اور مقابلے کے لیے ڈٹ جائے تو اسے
شیر کہا جاتا ہے۔ سردار بت بنا شیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے
ایک ایک قدم کھسکتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

جب اس کا اور شیر کا درمیانی فاصلہ کوئی تیس فٹ رہ گیا
تو سردار رک گیا۔ اب شیر بھی ایک جگہ ساکت و جامد کھڑا اپنی
شعلہ برساتی آنکھوں سے سردار کو گھور رہا تھا۔ ایک پل کے لیے
سارا جنگل خاموش و ساکت ہو گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے جنگل کا
ہر درخت، ہر چرند، ہر پرند آمنے سامنے کھڑے دو شیروں کا
مقابلہ دیکھنے کے لیے ہمہ تن گوش ہے۔ شیر کی دم خطرے کو محسوس
کر کے ہولے ہولے ہل رہی تھی۔

پھر ایک بجلی سی کوندی۔ شاید درخت پر کسی کے پاؤں سے
کھڑکا ہوا تھا۔ یا شاید کوئی پرندہ درخت سے اڑا تھا۔ سردار
کی توجہ ذرا بدلی تو شیر نے ایک خوفناک دہاڑ کے ساتھ سردار پر

حملہ کر دیا۔ اس کا زوردار پنجہ پوری قوت کے ساتھ سردار کی
ڈھال پر پڑا۔ سردار میں ایک پورے بھینسے کی طاقت تھی مگر
شیر کا پنجہ اس قدر بھرپور پڑا تھا کہ سردار اپنی جگہ سے ہل گیا۔
لیکن اس عرصے میں سردار کا چھرا اپنا کام کر چکا تھا۔ شیر کا نازک
پیٹ چاک ہو گیا تھا اور انتڑیاں باہر لٹکنے لگی تھیں۔ مگر شیر
پھر شیر تھا۔ وہ ایک بار پھر گرجتا ہوا سردار پر حملہ آور ہوا۔
اب کے وہ سردار کی گردن کو دبوچ کر اس کے ٹکڑے اڑا دینا
چاہتا تھا۔ زخمی شیر پہلے سے ہزار گنا بڑھ کر خطرناک ہو جاتا ہے۔
سردار اب کے چوکس ہو چکا تھا۔ اس نے ڈھال اپنے سر پر کر
لی اور ایک گھٹنا زمین کے ساتھ لگا لیا۔ جونہی شیر اس کے اوپر آیا
اس نے پے در پے شیر کے سینے میں کئی وار کیے۔ مگر شیر سردار
کو بھی گرا چکا تھا۔ اب شیر اس کے اوپر تھا۔ بیچ میں اگر ڈھال
نہ ہوتی تو سردار کی لاش کے کئی ٹکڑے وہاں روئی کی طرح دھنکے
پڑے ہوتے۔

سردار کے چھرے کا ایک بھرپور وار شیر کے دل پر پڑا اور
وہ جہاں تھا وہیں کا وہیں سمٹ کر بے جان ہو گیا۔ اتنے میں دوسرے
جنگلی بھی نیزے اچھالتے باہر نکل آئے۔ ڈھول والے بھی آ گئے
اور انہوں نے ڈھول بجاتے ہوئے سردار کو اٹھایا اور اس کے
گرد رقص کرنے لگے۔ سردار زخمی تھا۔ اس کے ایک بازو کا گوشت

لٹک رہا تھا اور داہنی ران پر شیر کے پنجے نے کھال گوشت
کے ساتھ ادھیڑ ڈالی تھی۔ قبیلے کے حکیم نے آگے بڑھ کر سردار کے
زخموں پر مرہم لگائی اور پتے رکھ کر کس کر پٹی باندھ دی۔ ساندل خان
نے نیچے اُتر کر سردار کو مبارک باد دی۔ وہ واقعی سردار کی دلیری پر
عش عش کر اٹھا تھا۔ شیر کا شکار ہو تو یوں مردوں کی طرح ہو۔
کہ شیر کے آمنے سامنے کھڑے ہو کر اُس کی آنکھوں میں آنکھیں
ڈال کر مقابلہ کیا جائے۔ نہ یہ کہ بندوق میں گولیاں بھر کر مچان پر
انسان بیٹھ جائے اور جب شیر نیچے آئے تو اُوپر سے پے در پے
گولیاں چلا کر اُسے ختم کر دیا جائے۔

لوگوں نے شیر کی لاش کو ڈولی ڈنڈا کر کے اُٹھا لیا اور قبیلے
کے پُرانے بہادری کے گیت گاتے ہوئے واپس گھر کی طرف چل
پڑے۔ اُس رات سردار کے اعزاز میں بہت بڑا جشن
منایا گیا۔

ساندل خان اور عبدل کو کاشان قبیلے کے سردار کی مہمانداری
میں گیارہ دن ہو چکے تھے اور اب وہ واپسی کی فکر میں تھے۔ یعنی
یہ کہ سفر کو آگے روانہ ہونا چاہیئے۔ چنانچہ ایک روز انہوں نے
سردار سے اجازت لی اور سفر پر چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ سردار
نے شیر کی کھال کا تحفہ ساندل خان اور ہاتھی دانت کے پھولوں
کے ایک تاج کا تحفہ عبدل کو دیا۔ اِس کے علاوہ ساتھ کھانے

پینے کو بہت سا خشک گوشت اور پانی بھی رکھ دیا۔ جُدا ہونے
سے پہلے سردار دونوں سے گلے ملا۔ ساندل اور عبدل اُسے
الوداع کہہ کر اپنے سفر کو روانہ ہو گئے۔ جب تک وہ نظروں
سے اوجھل نہیں ہوئے سردار اور اُس کے ساتھی ٹیلے پر کھڑے
اُنہیں ہاتھ ہلا ہلا کر الوداع کہتے رہے۔

باب ۹

منزل کی روشنیاں

سانڈل خان جس نقشے کے مطابق سفر کر رہا تھا اُس میں وہ پروم اور اکیاب کو شمال مغرب کی طرف چھوڑ آیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خلیج بنگال کی کھاڑی میں چار روز کے سفر سے بچ گئے تھے۔ اگر عبدل کے ساتھ پنجاب کا یہ جوان نہ ہوتا تو اُس کا برما کے جنگلوں اور خلیج بنگال کے سیاہ سمندر سے بچ کر نکل آنا بہت مشکل تھا۔ سانڈل خاں شمالی اور وسطی برما کے گھنے جنگلوں کا بھیدی تھا۔ کاشان قبیلے کی بستی سے نکل کر وہ جنوب مشرقی گھاٹی سے ہوتا ہوا اراکان سٹیٹ کی سرحدوں کو چھوتا اُوپر بنگال کی طرف چلتا دریائے پھوانگ کے کنارے پہنچ گیا۔ سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ اِن سارے علاقوں اور جنگلوں پر اب جاپانیوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ کوئی خبر نہیں تھی کہ جاپانی گوریلوں کے دستے کس جگہ چھپے بیٹھے ہیں۔ پھر بھی سانڈل خاں اپنے تجربے، عقل اور ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے عبدل کو ساتھ لئے پھونک پھونک کر راہ بناتا آگے بڑھ رہا تھا۔ ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ کہیں وہ راستے سے بھٹک کر آسام کی سرحدوں کی جانب نہ

نکل جائے جہاں اسپھال کے محاذ پر جاپانیوں اور انگریزی و ہندوستانی فوجوں کے درمیان گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی لیکن انہیں بھاری توپوں کی آوازیں دُور سے بھی سُنائی نہیں دے رہی تھیں۔ اس کا صاف مطلب یہی تھا کہ وہ جنگ کی فرنٹ لائن سے بہت دُور ہے۔ کیونکہ بھاری توپ خانے کی آواز بہت دُور تک جاتی ہے اور امپھال کے محاذ پر بھاری توپ خانہ حرکت میں آیا ہوا تھا۔ انگریز اس محاذ پر جاپانیوں کو پیچھے دھکیلنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ کیونکہ اس محاذ پر انگریزوں کی پسپائی کا مطلب یہ تھا کہ جاپانی ہندوستان پر قبضہ کر لیتے۔

مہاکوندی جنگل کے بیچوں بیچ بہنے والا دریائے پھوانگ ایک معاون دریا ہے جو آسام کی پہاڑیوں سے نکل کر اراکان کی جانب سے ہوتا دریائے ایراوتی میں آن گرتا ہے۔ اس دریا کا پاٹ زیادہ چوڑا نہیں تھا لیکن اس پر بنا ہوا آہنی پُل بڑا اُونچا اور مضبوط تھا۔ سانڈل خان اور عبدل یہ پُل عبور کر کے اراکان کی سرحدوں میں داخل ہو گئے۔ اراکان برما کا مسلم اکثریت کا علاقہ ہے۔ یہاں مسلمان بہت زیادہ تعداد میں آباد ہیں۔ شام کے وقت وہ ایک چھوٹی سی بستی میں پہنچے جس کی ایک چھوٹی سی مسجد میں برمی مسلمان نماز کی تیاریاں کر رہے تھے۔

دو روز اراکانی مسلمانوں کے ہاں قیام کرنے کے بعد جنگلوں

کے مسافر ایک بار پھر جنگلوں کے سفر میں کھو گئے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ رنگون اور برما کے دوسرے شہروں سے ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں لوگ قافلہ در قافلہ روانہ ہوئے تھے مگر اس طرف سے ایک بھی قافلہ نہیں گزرا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ علاقہ گمنام تھا اور عام سرحدی راستوں سے کافی ہٹ کر واقع تھا۔ لیکن خشکی کا صرف یہی ایک راستہ تھا۔ باقی تمام راستوں پر سفر کرتے ہوئے کسی نہ کسی مقام سے خلیج بنگال کے کالے پانی کو ضرور عبور کرنا پڑتا تھا۔

اب جنگل میں ایسے درختوں کی بہتات تھی جو شہری آبادیوں کے قرب وجوار کا پتہ دیتے ہیں۔ مثلاً چیڑھ، سنبل، شہتوت آم اور کیلا وغیرہ۔ دیودار کے درختوں کا بھی سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ دیودار کے درختوں کی کٹائی کا موسم ختم ہو چکا تھا اور اب برسات کے موسم کی آمد آمد تھی۔ ساندل خان چاہتا تھا کہ بارشیں شروع ہونے سے پہلے ہی وہ اور عبدل بنگال کے سرحدی شہر کاکسز بازار پہنچ جائیں۔

"آسام اور برما کے جنگلوں کی بارشوں سے خدا کی پناہ! کئی کئی مہینے آسمان سیاہ بادلوں میں چھپا رہتا ہے اور کئی کئی دن مسلسل بارش ہوتی رہتی ہے۔ ندیاں جھیلیں بن جاتی ہیں اور جھیلیں سمندر کا نقشہ پیش کرنے لگتی ہیں۔ میدان دلدل بن جاتے ہیں۔ تمام

راستے بند ہو جاتے ہیں۔ جہاں کوئی ہے بس وہیں کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ اتنے بڑے بڑے مچھر پیدا ہوتے ہیں کہ ان پر مکھیوں کا گمان ہوتا ہے اور اس علاقے کا ملیریا تو ساری دنیا میں مشہور ہے۔"

عبدل نے کہا۔

"لیکن ابھی برساتیں شروع ہونے میں پندرہ بیس روز باقی ہیں۔"

ساندل کہنے لگا۔

"بچو جی! تم بھی برما میں ساری عمر رہے ہو اور میں نے بھی عمر کا ایک حصہ ان جنگلوں کی خاک اڑاتے گزارہ ہے۔ پندرہ دن آگے پیچھے ہو جانا اس علاقے کی مون سون کے لیے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ خدا نہ کرے اگر بارشیں شروع ہو گئیں تو سمجھو ایک سال تک اسی جنگل کے کسی پہاڑی غار میں بھوکے پیاسے رہ کر گزارہ کرنا ہوگا۔"

مگر یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ بادل ایک دوبار آئے مگر بارش برسائے بغیر ہی گزر گئے۔ عبدل نے ان بادلوں کو خوفزدہ نظروں سے دیکھا تھا اور خدا سے دعائیں مانگی تھیں کہ ابھی بارش نہ ہو۔

تین دن کے سفر کے بعد وہ ایک ایسی بستی میں پہنچے جو اراکان سٹیٹ اور جنوبی بنگال کی سرحد کے بیچ میں واقع تھی۔ یہاں کی دکانوں کے چبوترے برما کی دکانوں کی مانند زمین سے بہت کم اونچے تھے۔ لیکن بنگال کے خدوخال بھی یہاں کے لوگوں میں دکھائی دیتے تھے

تھے۔ چیتے برمی ناک ہو۔ل ختم ہو گئے تھے اور بنگالی سیاہ آنکھوں کا علاقہ شروع ہو چکا تھا۔ سندل خان نے عبدل کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! خدا کا شکر بجا لاؤ۔ ہم ٹھیک راستے پر چلتے ہوئے اپنی منزل کے قریب ترین پہنچ گئے ہیں۔"

عبدل نے سانڈل خان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"اگر خدا کی رضا اور آپ کا ساتھ نہ ہوتا تو میرے لیے اکیلے یہ سفر کرنا محال تھا۔"

عبدل نے کہا۔

"ایسا نہ کہو بیٹے! جو آدمی ہمت نہ ہارے اور دلیری کے ساتھ بڑے حالات کے مقابلے کے لیے ڈٹ جائے اُس کی خدا ضرور مدد کرتا ہے اور وہ کبھی ناکام نہیں ہوتا۔ تم ایک بہادر لڑکے ہو۔ تم نے جس قدر بھی جنگل میں اکیلے سفر کیا وہ ایک کمزور دل لڑکے کو ڈرا دینے کے لیے کافی تھا۔ مگر تم نے حوصلہ نہیں ہارا۔ حالات کی خرابی اور مصیبتوں کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے۔ بلکہ اتنی چھوٹی سی عمر میں جس جوانمردی اور پختہ عزم سے تم نے آفتوں کا مقابلہ کیا اُس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔"

اس بستی کا نام کچھ برمی اور کچھ بنگلہ زبان میں تھا۔ یہاں چیتے

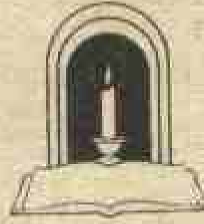
برمی ناک بھی تھے اور سیاہ بنگالی بال بھی۔ بیک وقت دونوں زبانیں بولی جا رہی تھیں۔ عبدل اس بستی میں اپنے ساتھی کے ہمراہ ایک سرائے میں ٹھہرا۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ کاکسز بازار شمال مغرب میں ایک سو اسّی میل کے فاصلے پر ہے۔ ایک روز بستی میں قیام کرنے کے بعد دونوں آگے کاکسز بازار کی سمت روانہ ہو گئے۔ اُن کے پاس پیسے ختم ہو چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے شیر کی کھال اور ہاتھی دانت کا تاج مجبوراً فروخت کر دیا۔ اُس کے عوض جو رقم ملی اُس سے راستے کا سامان، کپڑوں کی جوڑی اور جوتے وغیرہ خریدے مسلسل سفر کرتے ہوئے اُن کے کپڑے اور جوتے جگہ جگہ سے پھٹ چکے تھے۔

برمی بنگالی بستی سے کاکسز بازار تک کا سفر ایک پتلی سی سڑک کا سفر تھا جو کبھی جنگل میں داخل ہو جاتی اور کبھی جنگل کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیتی۔ یہ کچی سڑک تھی اور اس پر سُرخ رنگ کی کنکریاں بچھی ہوئی تھیں۔ دونوں جانب سنبل اور چھالیہ کے اونچے اونچے درخت کھڑے تھے۔ یہ سڑک محکمہ جنگلات کی طرف سے بنائی گئی تھی اور محکمہ جنگلات کی زبان میں اِسے سانپ لائن کہتے ہیں۔ یہ جنگلوں کو آگ سے محفوظ رکھنے کے لیے بنائی جاتی ہے کہ اگر جنگل کے ایک قطعے میں آگ لگ جائے تو دوسرے قطعے کو آگ سے بچایا جا سکے۔ ایک جگہ انہیں درختوں کے

نیچے ہاتھیوں کا غول دکھائی دیا جو جھومتا ہوا سڑک عبور کر رہا تھا۔ وہ دونوں سڑک پر رُک گئے اور جنگلی ہاتھیوں کو ایک ایک کر کے جھولتے جھامتے سڑک پر سے گزرتے دیکھتے رہے۔ جب تمام ہاتھی جنگل کے ایک حصے سے نکل کر دوسرے حصے میں داخل ہو گئے۔ تو وہ بھی وہاں سے آگے کو چل پڑے۔

اسی طرح چلتے چلتے یہ دونوں دلیر اور جواں مرد مسافر جنگلوں کی مصیبتوں، جنگلی قبیلوں کی آفتوں اور ناگہانی بلاؤں کا مقابلہ کرتے دریاؤں، دلدلوں، جھیلوں، پہاڑوں اور دشوار گزار گھاٹیوں کو عبور کرتے منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ جس روز انہیں دُور سے کاکسز بازار کی جھلمل جھلمل کرتی روشنیاں نظر آئیں تو خوشی سے اُن کے چہرے کھل اُٹھے۔ وہ بے اختیار سجدوں میں گر گئے اور خدا کا شکر بجا لائے کہ جس نے انہیں مصیبتوں کا مقابلہ کر کے اپنی منزل پر پہنچنے کی توفیق عطا کی۔





٦
ڈراموں کا مکمل سیٹ

- حکیم جی : مختلف ٦ ڈراموں کا آسان مجموعہ۔
  ترتیب : عشرت رحمانی
- انوکھی تقسیم : اس مجموعہ میں ٦ ڈرامے ہیں۔
- وطن کی مٹی : قومی جذبہ بیدار کرنے والے ٦ ڈرامے
- زندہ باد : سبق آموز اور مزاحیہ ۵ ڈراموں کا سیٹ۔
- کرائے کا مکان : قومی اور مزاحیہ ٦ ڈرامے پیش کیے گئے ہیں۔
- بھارت کے لال : مجاہد، فریادی، انعام جیسے بہترین ڈراموں کا انتخاب۔

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز
لاہور • حیدرآباد • کراچی

